بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ

31 Wednesday DEC 2014

کتاب پڑھنے کی دعا (اول آخر ایک بار درود شریف پڑھ لیجئے)

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ عَلَیْنَا حِکْمَتَکَ وَانْشُرْ عَلَیْنَا رَحْمَتَکَ یَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

اے اللہ ہم پر علم و حکمت کے دروازے کھول دے اور ہم پر اپنی رحمت نازل فرما اے عظمت اور بزرگی والے۔ (آمین)

اردو نوٹز برائے جماعت دہم

اردو نوٹز

غمگین شیراز ڈار

نوگام چرار شریف

ایم، اے اردو، بی ایڈ

10th Class Urdu Notes

Prepared By Gumgeen Sheraz Dar

Nowgam- Charar-i- Sharief

(7889726757)

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

لوٹ:۔ اگر کسی بھی نوٹ میں کوئی غلطی یا خامی وغیرہ ہوں تو براہِ کرم تنقید نہ کریں اصلاح کریں کیوں کہ میں بھی ایک انسان ہی ہوں کوئی فرشتہ نہیں ہوں کہ غلطی نہ ہوسکے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔۔۔۔۔۔

والسلام۔۔۔

اردو نثری اصناف

داستان

اردو نثر کی سب سے قدیم صنف داستان ہے۔ داستان کے بارے میں سوچتے ہی ہمارے دماغ میں ماضی کے معاشرت کی تصویر ابھر آتی ہے۔ داستان کا اصل مقصد تفریح ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگوں کے پاس فراغت تھی۔ لوگ دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر محفلیں اور مجلسیں سجاتے تھے اور کہانیاں سُن سُن کر دل بہلاتے اور وقت بتاتے تھے۔ اس طرح دن بھر کی تھکن دور ہوتی تھی۔ اردو کی نثری اصناف میں داستان کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں ناولوں سے پہلے داستانوں کا رواج عام تھا۔ اردو میں داستانوں کا رواج ہمیں اس زمانے سے ملتا ہے جب اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ بادشاہ داستانوں کے بڑے شوقین تھے اسلئے وہ درباروں میں داستان گو ملازم رکھتے تھے۔ جو باقاعدہ مجلسوں میں داستانیں سُنا کر سامعین کو کچھ دیر کے لئے فرحت و مسرت کا سامان مہیا کرتے تھے۔ ان داستانوں میں جنوں، دیوؤں اور پریوں کے حیرت انگیز اور عجیب و غریب کارنامے بڑے اسلوب کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے۔ بظاہر ان قصوں کو حقیقی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ان میں اس زمانے کی معاشرت کی عکاسی ہوتی تھی۔ اردو میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد داستانیں لکھی گئی۔ اس ادارے کا سب سے اہم کارنامہ میر امن کی "باغ و بہار" ہے۔ یہ داستان تحسین کی "نو طرزِ مرصع" کی مشکل زبان کا سلیس اور آسان ترجمہ ہے۔ شیر علی افسوس کی "آرائشِ محفل" اور حیدر بخش حیدری کی "طوطا کہانی" فورٹ ولیم کالج ہی کی دین ہے۔ جنوبی ہند میں لکھی گئی ملا وجہی کی "سب رس" اردو کی قدیم ترین داستان ہے۔ شمالی ہند میں لکھی گئی اردو کی پہلی داستان "قصہ مہر افروز و دلبر" ہے۔ "فسانۂ عجائب" بھی اردو کی اہم ترین داستان ہے۔ یہ رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ہے جو ۱۸۲۴ء میں سامنے آئی۔

انیسویں صدی کے آخر میں جب نئی تہذیب کی چکاچوند نے اردو زبان و ادب کو نئی منزلوں کی طرف متوجہ کیا تو اس کا اثر داستان پر بھی پڑا۔ داستان نے اردو نثر کو نئے اسلوب سے نوازا۔ لیکن زمانہ بدلتا گیا، زندگی بدلتی گئی۔ مغربیت نے اپنے پر پھیلائے انسانوں کا سکون و چین اور فراغت سیاسی غلامی اور معاشی بدحالی اور مشینی تیز رفتار کی نذر ہو گیا۔ داستان کا رواج بھی ماند پڑتا گیا اور اس کی جگہ ناول نے لے لی۔

Scanned with CamScanner

ناول

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے اور اطالوی زبان کے لفظ "ناویلا" سے مشتق ہے جس کے معنی "نیا" کے ہیں۔ کہانی کی اس قسم کو یہ نام اسلئے دیا گیا کیونکہ اس کا انداز داستان سے بالکل الگ ہے۔ اصطلاح میں ناول اس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جس میں حقیقی عہد کے پس منظر میں فرد اور سماج کی کشمکش دکھائی گئی ہو۔ ناول انگریزی ادب کے زیر اثر اردو میں آیا۔ اردو ادب کی دوسری بیشتر اصناف کی طرح ناول کی بھی کوئی جامع، مکمل اور حتمی تعریف ممکن نہیں۔ "ناول" اس نثری تحریر کا نام ہے جس میں کوئی ایسی کہانی بیان کی گئی ہو جو زندگی کی ترجمانی کرتی ہو۔ اس میں مختلف کردار ہوتے ہیں جن کے سہارے واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ اور مکالمہ نگاری کے ذریعے کرداروں کے درمیان گفتگو کو نقل کیا جاتا ہے اس میں دو کردار "ہیرو" اور "ہیروئن" اہم ہوتے ہیں اور باقی کردار ان کے گرد گھومتے ہیں۔

حقیقت میں ناول اجتماعی یا انفرادی زندگی کی ترجمانی اور تصویر کشی کا نام ہے ایک ایسی کہانی جس کو ناول نویس زندگی کے حقائق سے اخذ کرکے اپنے فکر و خیال سے ایک نئے رنگ اور صورت میں پیش کرتا ہے۔ عام طور پر ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، نظریۂ حیات اور منظر نگاری کو شامل کیا جاتا ہے۔ ایسے ناول بھی لکھے گئے جن میں یہ روایتی اجزاء نہیں ملتے۔ پلاٹ، موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ناول کی کئی قسمیں ہیں۔ ناول "المیہ" بھی ہو سکتی ہے اور "طربیہ" بھی۔ وہ ناول جس سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو اور اس کا انجام "ہیرو" کی کامیابی پر ہو "طربیہ" ناول کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس "المیہ" ناول کا انجام المناک ہوتا ہے اور اس کو پڑھنے کے بعد دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ ناول میں ہمارے مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ ناول پڑھے لکھے اور مہذب انسانوں کی ایجاد ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں چونکہ ہندوستان انگریزوں کے ماتحت تھا۔ لہٰذا تعلیم و تہذیب کے اثر سے ہندوستان میں نئی ترقی کے آثار رونما ہوئے۔ اس زمانے میں نذیر احمد اور ان کے ہم عصر ادبا کے ہاتھوں سے ناول کا آغاز ہوا۔ انہوں نے عمدہ اخلاق ساز اور سماج سدھار ناولیں لکھیں۔ نذیر احمد کے ناولوں میں "مراۃ العروس"، "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت"، اور "فسانۂ مبتلا" خاص اہمیت کے حامل ہے۔ اس دور کے دوسرے مصنف رتن ناتھ سرشار ہے۔ ان کا قصہ "فسانۂ آزاد" بہت مقبول ہوا۔ سرشار کے بعد شرر کا نام آتا ہے۔ شرر نے مضمون، تاریخیں اور ناول بھی لکھے۔ مگر وہ ناول نویس کے طور پر مشہور ہوئے۔ شرر کو "اردو والٹر اسکاٹ" کہا گیا ہے۔ سجاد حسین، نواب آزاد اور جوالا پرشاد کے تراجم اردو ناول کی تاریخ میں اہم ہیں۔ مرزا رسوا کے ناولوں سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کا ایک مشہور ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ اس ناول سے ان کی فن کاری ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد راشد الخیری کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ اپنی ناولوں میں عورتوں کی مظلومیت کو بیان کرتے ہیں وہ ناولسٹ سے زیادہ انشاپرداز تھے۔ رسوا کے بعد پریم چند نے بھی اپنی ناولوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ پریم چند کے بعد قاضی عبدالغفار، عزیز احمد، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ نے بھی ناول لکھے۔

Scanned with CamScanner

افسانہ

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کہانی سننا اور کہتا آیا ہے۔ پہلے جب انسان کے پاس وقت کافی تھا تو وہ طویل قصے اور کہانیاں سنتا سناتا تھا لیکن زمانہ بدلتا گیا اور انسان کی فرصتیں پہلی سی نہ رہی اور اس نے انسان کے مسائل کو سمجھنا سمجھانا شروع کیا۔ اس طرح ناول کی شروعات ہوئی۔ ناول نے زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا۔ اس کے بعد مختصر افسانہ وجود میں آیا۔

اردو میں مختصر افسانہ وہی نثری صنف ہے جسے انگریزی میں شارٹ سٹوری کہا جاتا ہے۔ مختصر افسانے کی صنف اردو میں مغرب کے اثرات کی دین ہے۔ مختصر افسانے کی ابتداء انیسوی صدی کے شروع میں امریکہ میں ہوئی۔ وہاں واشنگٹن ارنگ نے "اسکیچ بک" (Sketch Book) لکھ کر مختصر افسانے کا پہلا نمونہ پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مختصر افسانے کو پڑھ کر قاری کے دل پر ایک خاص کیفیت گزرتی ہے اور یہی مختصر افسانے کی پہچان ہے۔ مختصر افسانے سے مراد نثر میں لکھی گئی ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کو اسطرح پیش کیا جائے کہ قاری کی اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ اس میں کسی ایک واقعہ، کسی ایک خیال، ایک احساس، ایک تجربہ کو کم سے کم اور خوبصورت سے خوبصورت لفظوں میں اس ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے کہ شروع سے آخر تک ایک تاثر قائم رہے اور ساتھ ہی ابتدا، ارتقا اور انجام کا بھی احساس رہے۔ اس کے علاوہ کہانی کو دلچسپ بنانے میں تخیل اور جذبے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ افسانے کی یہ بھی تعریف کی گئی ہے کہ کوئی ایسا بیان جو مکمل ہو اور ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے۔ افسانے میں ایک یا ایک سے زیادہ کردار ہو سکتے ہیں۔ منظر نامہ، پلاٹ یا مکالمہ بھی ہو سکتا ہے۔ مختصر افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ پوری زندگی کے بجائے اس کے کسی ایک گوشے کی جھلک دکھاتا ہے۔ تفصیل اور پھیلاو کے بجائے اس میں اختصار اور ایجاز پایا جاتا ہے۔ اختصار کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام بیانات، کردار، واقعات، مکالمات اور مناظر کہانی میں شامل نہ ہوں جو وحدت تاثر کی راہ میں حائل ہوں اور بنیادی نکتے سے توجہ ہٹا دیں۔

اردو میں مختصر انیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے پریم چند نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے صنف افسانہ نے ایسی ترقی کی کہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہو گئی 1932ء میں افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" شائع ہوا۔ اور باضابطہ طور پر افسانوں کا دور شروع ہوا۔ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں کئی برس تک فسادات کے موضوع پر بہترین افسانے لکھے گئے اور انسانی قدروں کے زوال نیز تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا احساس عام ہوا۔ بدلتے ہوئے حالات اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ افسانہ بھی پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اشاروں کی زبان اختیار کی اور بعض نے حقیقت پسندی کے اصول کو اپنا لیا۔ افسانے میں حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں علی عباس حسینی، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، غلام عباس وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

— ✱ —

Scanned with CamScanner

خاکہ

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔ خاکہ انگریزی لفظ (Sketch) کا ترجمہ ہے۔ خاکے کو مرقع یا قلمی تصویر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن عام اصطلاح میں اس کو خاکہ ہی کہتے ہیں۔ اس کا فن غزل اور افسانے کے فن سے بہت مشابہت رکھتا ہے کیونکہ اختصار اس کا بنیادی شرط ہے۔ جبکہ یہ خاکہ نگاری افسانے سے بہت قریب ہے اس لئے خاکہ کو موجودہ دور میں اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ خاکہ نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی تصویر ہے۔ خاکہ سے مراد ایک ایسی نثری تحریر جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے۔ اس میں جس شخص کی تصویر کشی کی جاتی ہے اس کے خیالات و افکار، سیرت و کردار، عادات و اطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کامیاب خاکہ نگار وہی ہے جو بغیر کسی لحاظ و تکلف کے اصل اور حقیقی باتیں سامنے لائے۔ خاکہ نگار جس طرح کسی شخص کو سمجھتا اور جانتا ہو، ایسے اسی طرح اس کا صحیح اور درست نقشہ کھینچنا چاہئے۔ خاکہ نگار اس شخصیت سے نہ صرف متاثر ہو بلکہ اس انسان کی شخصیت سے مکمل واقفیت اور قربت بھی رکھتا ہو تب اس کا خاکہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ پہلی ملاقات یا چند ملاقاتوں کے تاثرات کی بنیاد پر کسی کا خاکہ لکھ دینے سے خاکہ نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خاکہ نگار کی تحریر سے مرعوبیت کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا بیان غیر جانبدارانہ ہونا چاہئے۔ جس طرح خوبیوں کا بیان مرعوبیت سے پاک ہونا چاہئے اسی طرح خامیوں کے بیان میں تحقیر و اہانت یا ذاتی دشمنی و عناد کا پہلو نہیں آنا چاہئے۔ خامیوں کے بیان سے بھی اپنائیت کا احساس نمایاں ہونا چاہئے۔ اچھے خاکہ میں ان خصوصیات کا بیان بے تکلف، برجستگی اور لطیف مزاح کی چاشنی کے ساتھ ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" اور رشید احمد صدیقی نے "کُندن" کا خاکہ لکھ کر یہ واضح کیا کہ خاکے کے موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں، معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ اچھا برا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، ہر طرح کے انسان کا خاکہ لکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ خاکہ نگار نے اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں نزدیک سے دیکھا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ خاکہ نگار کا قلم مردہ جسم میں جان ڈال دینے کے ہنر سے واقف ہو۔

عبدالحلیم شرر، مولوی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں سے بھی خاکوں کے نمونے نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۳ء - ۱۹۴۷ء) سے ہوا۔ انھوں نے نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی اور خاکے بھی لکھے۔

NOTES

عصمت چغتائی اور منٹو نے بھی بہت اچھے خاکے لکھے۔ اعجاز حسین، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی بھی اہم خاکہ نگار رہیں۔ محمد طفیل اور مشتاق احمد یوسفی کے لکھے ہوئے خاکے بہت جاذب نظر ہیں نثری اصناف میں خاکہ نگاری بہت مقبول ہے۔ یقین ہے کہ یہ صنف برابر ترقی کرتی رہے گی۔

Scanned with CamScanner

انشائیہ

انشائیہ دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ انشائیہ کے لغوی معنی ہیں "بات سے بات پیدا کرنا"، "عبارت کو سجانا اور آراستہ کرنا"۔ اردو میں یہ صنف انگریزی سے آئی۔ انگریزی میں اسے "ایسے" (ESSAY) کہتے ہیں۔ اس صنف کو انسانی شخصیت کے اظہار کا لازمی جز قرار دیا گیا ہے۔ بقول مغربی مصنف رابرٹ لِنڈ، "انشائیہ نگار سے ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی طرزِ تحریر سے ہمیں خوش کرے اور جس موضوع پر وہ لکھ رہا ہے اس پر اختصار کے ساتھ کچھ نئی قدر نئی روشنی ڈال دے اور بس"۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر عصمت اللہ نے انشائیہ کو انگریزی کے "پرسنل ایسے" Personal Essay سے مماثل قرار دیا ہے۔ جاوید ششٹ نے ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" سے انشائیہ کے نقوش کی نشاندہی کرکے بتایا کہ ہمارا انشائیہ کلینا" ہمارا اپنا انشائیہ ہے۔ جدید ناقدین کے مطابق مضمون کے کسی حصے میں ذاتی اور انفرادی تجربات کا ایسا اظہار جس سے مضمون نگار کی شخصیت واضح ہو "انشائیہ" ہے۔ شگفتہ بیانی، رنگینی، تازگی اور دلکشی انشائیہ کے اسلوب کی خصوصیت ہیں۔

انشائیہ میں انشائیہ نگار کے سامنے کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بے تکلف، بلا جھجک اور بے ساختہ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر اپنے تاثرات بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے دل کی باتیں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے مگر ان باتوں میں تازگی، ندرت اور شگفتگی کا ہونا لازمی ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ انشائیہ مضمون نگاری کا وہ جُز ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے۔ اس پیشکش میں اس کی اپنی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ انشائیہ کے تجربے زندگی پر ایک نئے زاویئے سے روشنی ڈالتے ہیں، وہ بات میں سے بات کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ انشائیہ کی خصوصیت، اس کا اختصار، اظہارِ شخصیت اور انبساط مقصد ہے۔ اس میں طنز و مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ اُس کا کوئی لازمی جُز نہیں ہے۔ انشائیہ بے ربط ہوتا ہے۔

اردو انشائیہ کا بانی سر سید احمد خان کو کہا جاتا ہے۔ ان کا مضمون "بحث و تکرار" اردو انشائیہ کا اولین نمونہ ہے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد کی "نیرنگِ خیال" بھی انشائیہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی کئی اہم انشائیے لکھے۔ مولوی ذکاءاللہ کا تحریر کردہ "ہوا" بھی انشائیے کی خصوصیت رکھتا ہے۔ مولانا حالی کا "زبان گویا" بھی ایک اہم انشائیہ ہے۔ ان کے علاوہ شبلی نعمانی، منشی سجاد حسین، ناصر علی، عبدالحلیم شرر، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مہدی افادی، رتن ناتھ سرشار، وحیدالدین سلیم، باقر علی، ناصر علی، وزیر آغا، یوسف ناظم، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، برج نرائن چکبست، شوکت تھانوی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عابدہ حسین، قرۃالعین حیدر وغیرہ نے بھی اعلیٰ معیار کے انشائیے لکھے ہیں۔ موجودہ دور کے مسائل کے اظہار کے لئے انشائیہ موزوں ترین صنفِ ادب ہے۔ انشائیہ نے سیاسی، سماجی، نظریاتی، فلسفیاتی، کیفیاتی، جغرافیائی، تاریخی اور ادبیاتی غرض ہر پہلو کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اُردو نثر میں انشائیے کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔

Scanned with CamScanner

"مقالہ"

مقالہ عربی لفظ ہے جس کے معنی "قول" یا "مقالہ" کے ہیں۔ مقالہ اس قسم کی تحریر کو کہتے ہیں جس میں کسی موضوع یا شخصیت کے بارے میں پوری تحقیق کے ساتھ بحث کی جائے تاکہ وہ موضوع ہر لحاظ سے مکمل اور مدلّل بیان ہو۔ اس طرح مقالہ بہت طویل ہوتا ہے۔ یعنی مقالہ میں کوئی بات دلیل اور بحث کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ مقالہ ~~بھی~~ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت، اور دیانت ہوتی ہے۔ اس کے دائرے میں قلم کار کو علمی و سائنسی اور فاضلانہ و عالمانہ امور کو سمانے کا موقع ملتا ہے۔ مقالہ نگار اپنے مضمون کو پوری چھان بین اور تحقیق کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مقالہ کی زبان ادبی اور سنجیدہ ہوتی ہے۔ اس میں شیریں اور شگفتہ زبان استعمال ہوتی ہے۔ اس میں تحقیق کوششوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسلئے یہ صنف ادبی لحاظ سے بڑی کارآمد اور نہایت مفید ہوتی ہے۔ ایک ناقابل فہم اور دشوار بات جو بے حد سنجیدہ ہوتی ہے، وہ معلوماتی سنجیدگی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ مقالے انسانوں کی زندگی، اخلاقی، سماجی، سیاسی، تمدنی و تاریخی غرض ہر موضوع پر لکھے جاتے ہیں اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے ان پر تفصیلی بحث کی جاتی ہے۔

اسی طرح ادب، شاعری، تنقید اور فن جیسے ادبی امور بھی مقالوں میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک ذی علم ادیب ان عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈال سکتا ہے۔ مقالہ میں علم و حکمت، دانش و فلسفہ یا سائنس کی بڑی بڑی باتوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ مقالوں کی زبان اور بیان صاف واضح اور دلکش ہوتی ہے۔ اردو میں بھی بڑے بڑے مقالہ نگار پیدا ہوئے۔ اور آج کل بھی مقالے علمی اور ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خواجہ غلام السیدین، سر سید احمد خان وغیرہ نے بھی بہت عمدہ مقالے لکھے ہیں۔ اردو میں "مقالات حالی" اور "مقالاتِ آزاد" بہت مشہور ہیں۔

Scanned with CamScanner

ڈراما

ڈراما یونانی زبان کے لفظ "ڈراؤ" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی "عمل" یا "ایکشن" کے ہیں۔ ہر ملک اور ہر زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر مانا گیا ہے۔ ڈرامے کی ابتدا نقالی سے ہوئی ہے۔ ڈراما اردو ادب کی اہم ترین اصناف میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی اوّلین تعریف میں یونان کے شہرہ آفاق فلسفی و نقادِ ادب ارسطو کی "بوطیقا" سے ہوئی۔ جس میں وہ ڈرامے کو "انسانی اعمال کی نقل" قرار دیتا ہے۔ اس کے بقول "نقالی انسانی جبلت میں داخل ہیں۔ یہ بچپن سے ہی نظر آتی ہے اور اس کے ارتقائے کمال کا نام ڈراما ہے۔"

مختلف ڈراما نگاروں اور نقادوں نے اس کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں:-

۱۔ بقول سرو "ڈراما زندگی کی نقل رسم و رواج کا آئینہ اور سچائی کا عکس ہے۔"

۲۔ بقول وکٹر ہیوگو "ڈراما ایک آئینہ ہے جس میں فطرت منعکس ہوتی ہے۔"

۳۔ جان پال سارتر "ڈرامے کا فن ایسے عناصر کا مجموعہ ہے جن کی مدد سے زندگی کو تھیٹر میں پیش کیا جاتا ہے۔"

۴۔ اعجاز حسین لکھتے ہیں کہ "ڈراما اور اسٹیج کا جو گہرا ربط ہے اس کو سوچ کر یہ کہا جا سکتا ہے ڈراما اپنا خوبصورت طائر ہے اور اسٹیج اس کا پرواز۔ جس کر بغیر طائر بلندی نہیں حاصل کر سکتا ہے۔"

ان تعریفوں سے ڈراما کی صنفی نوعیت پوری طور پر واضح نہیں ہو جاتی۔

ڈراما فطرت اور انسانی افعال کی نقل کا فن ہے جس میں اداکاروں اور مکالموں کے ذریعے غیر متوقع اور تعجب خیز حالات میں انسانی قوتِ ارادی کا اظہار، تصادم، کشمکش اور عروج و زوال کی صورت میں تماشائیوں کے سامنے ایک معین وقت اور مخصوص انداز میں کیا جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے ڈرامے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جیسے، پلاٹ، کردار نگاری اور زبان و بیان یا اسلوب سے موسوم کیا گیا۔ ڈرامے کے پلاٹ کا گٹھا ہوا ہونا بہت ضروری ہے۔ یعنی اس میں واقعات کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ ایک تو ہر آنے والا واقعہ پہلے واقعے کے ساتھ جڑا ہوا ہونا چاہیے، دوسرا یہ کہ پہلے واقعے سے زیادہ متاثر کن کرے۔ پلاٹ میں واقعات کی تعداد جتنی کم ہو ڈراما نگار انہیں مؤثر بنانے کی طرف اتنی ہی زیادہ توجہ دے سکتا ہے۔ کردار نگاری کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تشکیل کرتے وقت کرداروں کی عمر، طبقے، تعلیم و تربیت اور خاندانی خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے۔ نہ بچوں کو بزرگوں کی طرح گفتگو کرتے ہوئے دکھایا جائے نہ بزرگوں کو بچوں کی طرح۔

ڈرامے کی زبان کا پرشکوہ ہو، پر اثر اور ایجاز و ارتکاز کی خصوصیت سے متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ اردو میں ڈرامے کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کا آغاز اودھ کے تاجدار علی شاہ کے ہاتھوں ۱۸۴۲ء میں "رادھا کنھیا کا قصہ" کی شکل میں ہوا۔ کچھ مدت بعد اس ڈرامے کی شہرت سے متاثر ہو کر امانت لکھنوی نے "اندر سبھا" کے نام سے ایک تجربہ کیا۔ جس نے اردو ڈرامے کی ترقی کے راستے کھول دیئے۔

Scanned with CamScanner

بیسویں صدی میں سائنسی اور تکنیکی ترقی کی وجہ سے اردو ڈرامے کو مزید فروغ ملا۔
ریڈیو کی ایجاد نے یک بابی ڈراموں کی تخلیق کے سامان پیدا کیے۔ اب ٹی وی نے
ٹیلی پلے کی شکل میں ڈرامے کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور
جدیدیت کی رو نے بھی اردو ڈرامے کو متاثر کرکے حقیقت پسند یا اشتراکی ڈرامے کے
ساتھ ہی ساتھ ایپک تھیٹر اور لایعنی ڈرامے کے تجربوں کو ممکن بنایا۔ اور اس طرح
اگر ایک طرف کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت اور علی محمد لون جیسے فن کار
ابھرے ہیں، تو دوسری طرف حبیب تنویر، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم حنفی جیسے
ماہرین فن نے اردو ڈرامے کو نئے آفاق سے روشناس کیا ہے۔

—— ★ ——

Prepared By Gumgeen Sheraz Dar. M.A. B.Ed.
Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief 7889726757

Scanned with CamScanner

Notes Pepared By Gumgeen Sheraz Dar.M.A B.Ed.
7889726757

نثر نگار

میر امن دہلوی

حالاتِ زندگی :—

میر امن کا اصلی نام میر امان اللہ تھا۔ میر امن دہلی میں 1732ء میں پیدا ہوئے۔ پہلے تخلص لطف اختیار کیا لیکن اپنی مشہور کتاب "باغ و بہار" میں اپنا تخلص استعمال نہیں کیا اسلئے اس تخلص سے بہت سے کم لوگ واقف ہیں۔ پھر میر امن تخلص رکھا۔ اُن کے آباو اجداد مغل بادشاہوں کے دورِ حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ بجھ گیا تو دہلی کے شریف گھرانے تلاشِ معاش میں ہندوستان کے مختلف گوشوں کی طرف روانہ ہوئے لیکن وہاں بھی سکون نہ پا کر کلکتہ کا رُخ کیا جو اس وقت امن کا گہوارہ تھا۔ کلکتہ میں نواب دلاور جنگ نے میر امن کو اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم کی اتالیقی کے لئے مقرر کیا۔ اسی اثنا میں "گلکرسٹ" تک رسائی ہوگئی اور فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو اردو پڑھانے پر چالیس روپے ماہواری تنخواہ پر معمور ہوئے۔ اس ادارے میں بہت سے ادیب موجود تھے لیکن اُن میں تین ادیب بہت مشہور ہوئے۔ میر امن دہلوی، شیر علی افسوس اور حیدر بخش حیدری۔ ان میں بھی سب سے زیادہ شہرت میر امن دہلوی کے حصے میں ہی آئی۔ آخر میں ان کا انتقال 1808ء میں کلکتہ میں ہوا۔

طرزِ تحریر :—

میر امن کا طرزِ تحریر اس قدر صاف، سادہ اور بامحاورہ ہے کہ سر سید احمد خان ان کو اردو نثر میں وہی رتبہ دیتے ہیں جو میر تقی میر کو اردو نظم میں حاصل ہے۔ میر امن دہلوی نے صرف دو کتابیں لکھیں ان میں صرف ایک ہی یعنی "باغ و بہار" ان کی بقا کی ضامن رہی۔ میر امن کی باغ و بہار کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کتاب سے مغلیہ عہد کے رسم و رواج اور رہن سہن کے بارے میں حقیقی اور سچی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اردو نثر کے ارتقاء میں اسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اردو نثر نگاری کے میدان میں یہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میر امن کی تحریر سے آج بھی قاری لطف حاصل کرتا ہے اور یہی میر امن کی زبان دانی اور موثر طرزِ تحریر کا ثبوت ہے۔ میر امن کو محاکات (باہمی بات چیت، باہمی داستان گوئی) اور جزئیات (چھوٹے چھوٹے امور، افراد) نگاری پر کمال کا عبور حاصل تھا۔ ان کی دوسری کتاب "گنج خوبی" ہے جو "ملا حسین واعظ کاشفی" کی فارسی کتاب "اخلاقِ محسنی" کا اردو ترجمہ ہے۔

Scanned with CamScanner

شمس العلماء مولوی نذیر احمد

(۱۸۳۳ء ..... ۱۹۱۲ء)

حالاتِ زندگی:۔

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور کے تحصیل نگینہ میں 1833ء کو پیدا ہوئے۔ نذیر احمد نام اور لقب شمس العلماء تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے باپ سعادت علی جو ایک عالم اور فاضل تھے سے حاصل کی۔ بعد میں مولوی نصر اللہ خان سے عربی کی تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی آئے۔ دہلی کالج میں نو سال تک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1854ء میں فارغ ہو کر محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ کالج کے دنوں میں ہی ان کے والد صاحب انتقال کر گئے۔ 1857ء کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد منتخب ہوئے۔ ملازمت کے دوران انہیں قانون کی مختلف انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا موقع ملا۔ ان ترجموں کے سبب حکومت نے انہیں محکمہ تعلیم سے نکال کر اولاً تحصیل دار اور بعد میں 1863ء میں ڈپٹی سیکریٹری بنا دیا۔ ریٹائر ہونے تک آپ اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ زندگی کا باقی حصہ تصنیف و تالیف میں اور سر سید احمد خان کے ساتھ قومی خدمت میں گزارا اور آخرکار ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

ادبی کارنامے:۔

مولوی نذیر احمد کو ہر فن میں کمال کا عبور حاصل تھا۔ اُن کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ مولوی نذیر احمد عالم دین، فقیہ، متکلم، مترجم قرآن، ادیب و شاعر، بلند پایہ خطیب اور مقرر تھے۔ آپ کے اندر شروع سے اسلامی جذبہ غالب تھا لہٰذا اپنا قلم معاشرے کی اصلاح کے لئے اُٹھایا۔ آپ کی زبان عام فہم، نہایت سادہ اور سلیس تھی۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان لکھنے میں آپ کو بے مثال مہارت حاصل تھی۔ مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کے بچے جب تعلیم پانے کی عمر کو پہنچے بس یہی بات اُن کو ناول نگار بننے کا بہانہ گئی۔ - - - - - ۔ آپ کو جب اپنے بچوں کے لئے مناسب کتابیں نہ ملیں تو آپ نے یہ پختہ ارادہ کیا کہ اپنے بچوں اور قوم کے بچوں کے لئے ایسا مناسب نصاب تیار کریں جن سے ان کے دماغ روشن ہوں اسی مقصد کے تحت آپ نے لڑکیوں کے لئے "مراۃ العروس" اور "منتخب الحکایات" اور لڑکوں کے لئے "چند پند" لکھیں۔ ان کے علاوہ "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت" اور "فسانۂ مبتلا" آپ کی مشہور ترین ناولیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی آپ بہت سی ناولیں لکھی جن میں "بنات النعش"، "رویائے صادقہ" قابلِ ذکر ہیں۔ غرض مولوی نذیر احمد کا شمار اردو کے ان مستند اور مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے زبان و قلم سے اردو ادب کو مالا مال کر دیا۔

Scanned with CamScanner

352-013 • WK 51 DEC 2014 18 Thursday

منشی پریم چند

(1880ء - 1936ء)

حالاتِ زندگی:-

پریم چند 1880ء میں بنارس کے ایک گاؤں بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ والد کا نام منشی عجائب لال تھا جو ایک ڈاکخانے میں ملازم تھے۔ پانچ سال کی عمر میں پڑھائی کا سلسلہ شروع کیا۔ اور چودہ سال کی عمر میں گورکھپور مشن اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گھریلو مجبوری کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کرکے استاد کی ملازمت اختیار کی۔ عمر کا کچھ حصہ بحیثیت استاد اور کچھ حصہ بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے گزارا۔ 1902ء میں الہ آباد ٹریننگ کالج سے انگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ حاصل کی۔ 1905ء میں اُن کا تبادلہ کانپور ہوا۔ کانپور کی زندگی اور ماحول نے ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم رول ادا کیا اور انہوں نے اصلاحی، سوانحی اور ادبی تبصرے لکھنے شروع کئے۔ پریم چند کی زندگی دکھوں اور پریشانیوں میں گزری۔ سوتیلی ماں، کم عمری میں شادی، تنگدستی اور ناداری نے پریم چند کو کندن بنا دیا۔ کانپور سے ان کا تبادلہ ہمیرپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے ہوا۔ وہاں کی آب و ہوا راس نہ آنے پر اور صحت کی نامساعد حالات کی وجہ سے گورکھپور چلے گئے۔ انہوں نے 1921ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ------- صحت مستقل طور پر خراب ہوتے لگی اور بیماری بڑھتی گئی اور 1936ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

ادبی کارنامے:-

پریم چند کا نام اُردو افسانہ نگاروں کی سرفہرست میں آتا ہے۔ اُردو افسانہ نگاری میں پریم چند کی حیثیت سنگِ نشان کی سی ہے۔ ان کے پانچ کہانیوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے صنف افسانہ اُردو گلشن کی مقبول ترین صنف ہو گئی۔ پریم چند کی پہلی کہانی ------- "انمول رتن" اور آخری کہانی "کفن" ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں "سوزِ وطن"، "پریم پچیسی"، "پریم چالیسی" اور "فانوسِ خیال" قابلِ ذکر ہیں۔ ناولوں میں "بازارِ حسن"، "میدانِ عمل" اور "گئودان" بہت ہی مشہور ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اکثر ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مرقعے اور کسانوں اور مزدوروں کی حقیقی تصویر ملتی ہے۔ آپ کی تحریر بہت سادہ، رواں، شائستہ، زوردار اور پُراثر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے پُرمغز اور معنی خیز باتیں بیان کرتے تھے۔ آپ نے زندگی کے گوناگوں مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ ادبی، لسانی، اصلاحی اور سوانحی موضوعات کو اپنے قلم سے روشناس کرایا۔ آج ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر پریم چند نہ ہوتے تو اُردو ادب میں ایک بہت بڑا خلا ہوتا۔ آپ نے ناولوں، افسانوں اور مختلف مضامین کے علاوہ فلمی کہانیوں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ آپ نے اپنا ایک پرچہ "ہنس" نکالا جو بہت ہی مقبول۔ اُردو ادب کے لئے اپنی ساری زندگی قربان کی۔

Wednesday 17 DEC 2014 351-014 • WK 51

نور شاہ (1936ء)

حالاتِ زندگی:-

نور شاہ کی پیدائش سرینگر کے علاقہ ڈلگیٹ میں 9 جولائی 1936ء کو ہوئی۔ بی، اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے دوران کئی عہدوں پر فائز رہے۔ اور بعد میں چیف ایگزیکیٹو آفیسر جے اینڈ کے انرجی ڈیولپمنٹ ایجنسی کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ادبی کارنامے:-

نور شاہ کی ادبی زندگی کا آغاز 22 سال کی عمر میں اُن کی پہلی کہانی "تلنی" عنوان کے تحت دہلی سے نکلنے والے ماہنامہ "شمع" کے شمارے میں جو شائع ہوئے سبب ہوا۔ آپ کی کہانیاں مختلف جرائد میں چھپنے لگیں۔ آپ کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے نامور اور معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اردو زبان کے موجودہ منظر نامے میں آپ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ زندگی آمیز تخلیقات پیش کرنے والوں میں آپ کی ایک الگ پہچان ہے۔ آپ اپنے افسانوں کا پلاٹ عام زندگی سے چُن کر روز مرہ واقعات تخلیقیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

آپ کے افسانوں کے مجموعے جن کے عنوانات "بے گھاٹ کی ناؤ" "ویرانے کے پھول"، "من کا آنگن اُداس اُداس"، "ایک رات کی ملکہ"، "گیلے پتھروں کی مہک"، "بے ثمر سچ"، اور "آسمان پھول اور لہو" داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ نور شاہ نے کئی ناول بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ساٹھ (61) سے زائد ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں۔ آپ کے مشہور ترین ناولوں میں "نیلی جھیل کالے سائے" اور "پایل کے زخم" قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ "بند کمرے کی کھڑکی" اور "کہاں گئے یہ لوگ" بھی بہت اہم تصانیف ہیں۔ آپ کی تصانیف فنی اعتبار کی حیثیت سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

13

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء ۱۹۶۱ء)

حالاتِ زندگی:۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی پیدائش قصبہ ہاپوڑ کے قریب سراوہ میں 20 اگست 1870ء کو ہوئی۔ بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق بے حد تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں ہی حاصل کی۔ سن 1894ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد پنجاب اور حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں بطور پرنسپل کام کیا۔ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری ہوئے اور عمر بھر اسی ادارے کی ترقی کے لئے کوشش کرتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔ڈی اور علی گڑھ سے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریاں حاصل کی۔ آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے تھے لیکن خاطر خواہ قدر نہ ہوئی۔ 16 اگست 1961ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

ادبی کارنامے:۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو زبان کے ان شیدائیوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری زندگی اس زبان کی خدمت میں وقف کردی۔ آپ ایک محقق، سوانح نگار، زبان، لغت نویس، قواعددان اور رائق انشاء پرداز تھے۔ آپ کی تحریروں پر سرسید، حالی اور محسن الملک جیسے عالم و فاضلوں کا اثر رہا ہے۔ آپ کی زبان سادہ اور خلوص کی پیکر ہے۔ بول چال کی سادہ زبان میں پر خلوص جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ہر بات سوچ سمجھ کر لکھتے تھے اور عبارت میں الجھاؤ نہیں ہوتا۔ جو کچھ لکھتے ہیں صاف ستھرے اور عام فہم انداز میں وضاحت سے لکھتے تھے۔ مشکل زبان لکھنے والوں کو وہ اردو کا دشمن سمجھتے تھے۔ اور آسان زبان لکھنے پر زور دیتے تھے۔ قدیم اردو ادب کی کتابوں کی تدوین، ترتیب و اشاعت آپ کا عمدہ اور بڑا کارنامہ ہے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے مولوی عبدالحق نے رسالہ نورس، رسالہ حسن، رسالہ افسر، رسالہ اردو اور رسالہ سائنس کی ادارت سنبھالی۔ تذکروں کے مرتب کی حیثیت سے انہوں نے "ذکات الشعراء" تذکرۂ ریختہ گویان، چمنستان شعراء اور گلشن شعراء وغیرہ شائع کئے۔ سنہ 1916ء میں "دریائے لطافت" مرتب کرکے شائع کی۔ "اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" اور "مرحوم دہلی کالج" جیسی کتابیں لکھ کر ادبی تحقیق کو پروان چڑھایا۔ مولوی عبدالحق کی وجہ سے دکنی ادبیات کی تحقیق کے نئے گوشے وا ہوئے جنہیں کسی اعتبار سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو بابائے اردو کے خطاب سے نوازا گیا۔

Scanned with CamScanner

سر سید احمد خان (1817ء) (1898ء)

حالاتِ زندگی:-

سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء کو دلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام میر متقی تھا۔ جو نہایت پرہیزگار انسان تھے۔ آپ کے خاندان کا تعلق مغلیہ سلطنت سے بہت قدیم تھا۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور تعلیم کی ساری ذمہ داری آپ کی والدہ محترمہ کے سر رہی۔ آپ کی والدہ بڑی پاک باز عورت تھیں۔ آپ نے عربی اور فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انگریزی کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ اپنی محنت، لیاقت اور صلاحیت سے ترقی کرتے کرتے جج بن گئے۔ آپ کو بادشاہِ وقت کی طرف سے "جوادالدولہ" اور "عارف جنگ" کے خطابات سے نوازا گیا۔ سرسید احمد خان کو مسلمانوں سے کافی ہمدردی تھی اسلئے اُن کی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے متمنی تھے۔ آپ 1866ء میں ولایت چلے گئے۔ آپ نے وہاں انگریزوں کی تہذیب اور طرزِ معاشرت کا مطالعہ کیا اور واپس آکر قوم کی خدمت کرنے میں مصروف رہے۔ آپ نے 1898ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا۔ اور کالج کے احاطے میں مدفون ہوئے۔

ادبی خدمات:-

سرسید ایک اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ آپ ایک بلند پایہ انشاء پرداز بھی تھے۔ آپ سادہ مگر پُرزور زبان میں لکھتے تھے۔ آپ کی نثر سادہ، واضح اور پُرزور ہے۔ آپ کی تحریر ہر طرح کے تکلف، تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ آپ مشکل ترین موضوع کو بھی آسان زبان میں بیان کرنے پر خاص قدرت رکھتے تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا۔ اور تاریخ پر آپ کی مستند کتابیں موجود ہیں جن میں "آثار الصنادید"، "جلاء القلوب" اور "تبیین الکلام" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ آج ملک میں کئی بڑے بڑے انشاء پرداز موجود ہیں لیکن ان میں سے کوئی سرسید کے احسانات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اگرچہ سرسید نے پہلے ہی ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام "سید الاخبار" تھا۔ اس اخبار کی زبان سادہ اور صاف تھی لیکن اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہیں مانی جاتی تھی۔ انہوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ اور اردو انشاء پردازی کو بلند مقام پر پہنچایا۔ اُن کی متعدد کتب، مضامین اور رسائل نے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا جن میں جامِ جم، اسبابِ بغاوتِ ہند، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، خطباتِ احمدیہ وغیرہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج کا قیام ہے۔ جس کی بنیاد ۱۸۷۷ء میں رکھی گئی۔ سرسید نے اس کالج کی ترقی کے لئے اپنا تن، من، دھن قربان کیا اور یہ سلسلہ اُن کی وفات تک جاری رہا۔

خواجہ غلام السیدین (۱۹۰۴ء - ۱۹۷۱ء)

حالاتِ زندگی:-

خواجہ غلام السیدین کی پیدائش ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو پانی پت میں ہوئی۔ آپ کے والد کا نام خواجہ غلام الثقلین تھا جو الطاف حسین حالی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ میٹرک سے لے کر بی، اے تک ہر امتحان میں صوبے میں اول آئے۔ سرکار کی طرف سے آئی، سی، ایس کرنے کے لئے انگلستان بھیجے گئے۔ مگر آپ نے حاکم بننے کی جگہ معلم بننا پسند کیا۔ انگلستان سے ہی ایم، ایڈ کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی اور واپس آکر پہلے علی گڑھ انگلش اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے اور بعد میں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں بطور پرنسپل کام کیا۔ اس کے بعد رام پور میں مشیر تعلیم کی حیثیت سے کام کیا۔ اور پھر کشمیر میں ناظم تعلیم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ خواجہ صاحب حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے مشیر اور جوائنٹ سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں میں مشیر اور پروفیسر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے اور علی گڑھ کے جامع نگر کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ادبی خدمات:-

خواجہ صاحب تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی زیادہ تر تحریریں انگریزی میں ہیں۔ اردو کی مشہور تصانیف میں "روح تہذیب" "آندھی میں چراغ"، "اصول تعلیم"، "قومی سیرت کی تشکیل" وغیرہ کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ قول و عمل دونوں حیثیت سے آپ ایک سچے معلم تھے۔ آپ کی تحریروں میں طبیعت کی شیرینی، مزاج کا خلوص اور جوانوں کی خدمت و تربیت کا جذبہ نمایاں ہے۔ آپ کی تصنیف "آندھی میں چراغ" برگزیدہ شخصیات کی سوانح، فنی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان پر مشتمل ہیں۔ آپ کی جملہ تصانیف فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی اور صداقت کی پیکر ہیں۔

Scanned with CamScanner

محمد عمر (۱۸۸۲ء-۱۹۴۶ء)

حالاتِ زندگی:—

محمد عمر 1882ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ آپ جموں کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہوا۔ آپ کے والد کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش آپ کے نانا کے ذمے ہوئی۔ 1894ء کو آپ کے نانا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کی پرورش آپ کی بے اولاد خالہ کے حصے میں آئی جس نے بڑی شفقت و محبت سے آپ کی پرورش کی۔ 1905ء میں رنبیر ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کے لئے لاہور کے فارمن کرسچن کالج میں داخلہ لیا۔ علم حاصل کرنے کی لگن بچپن سے ہی تھی ہر وقت خود کو کسی علمی کام میں مصروف رکھتے۔ ملازمت مل جانے پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور منصفی کا امتحان پاس کیا اور جج کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ 1936ء میں سب جج کے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور اس کے بعد وکالت کرتے رہے 1946ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور قلعہ باہو کے سامنے قبرستان پیر قادر بخش میں مدفون ہوئے۔

ادبی کارنامے:—

محمد عمر بچپن سے ہی ادب میں شوق رکھتے تھے۔ جب تھیٹریکل کمپنیاں جموں میں ڈرامے کھیلنے کے لئے آنے لگی تو ان ہی کمپنیوں کی سعادت سے محمد عمر کے وجود میں ادبی ذوق کی وہ چنگاری روشنی ہوئی جس نے ان سے بعد میں بہت سے ڈرامے لکھوائے۔ محمد عمر نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ کھیلے اور کھلوانے میں بھی کافی قدرت حاصل کی تھی۔ جس خاندان سے محمد عمر تعلق رکھتے تھے ~~اجو~~ اس خاندان نے علم و ادب کی شمع کو چراغاں رکھنے میں جو کارنامے انجام دئے انہیں اردو ادب کی کوئی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

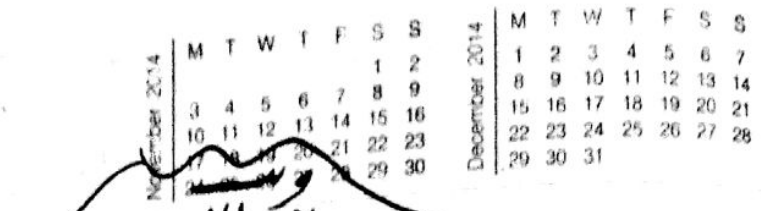

نور الٰہی

حالاتِ زندگی:-

منشی نور الٰہی کی ولادت 1883ء کے آس پاس ہوئی۔ لاہور ان کا آبائی وطن ہے۔ تعلیمی مراحل بھی وہیں طے کئے۔ اسکول کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آپ کی سرپرستی کی ذمہ داری آپ کے بڑے بھائی میاں فضل الٰہی کے سپرد تھی۔ منشی صاحب کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ریاست کے مہاراجہ پرتاپ سنگھ بھی کرکٹ کے شوقین تھے اور اکثر ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو اچھی کرکٹ کھیلتے ہوں۔ وہ ان کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انہوں نے منشی صاحب کو اپنی ٹیم میں شامل کر کے ریاست میں بلایا۔ اس طرح آپ نے اپنی تعلیم ترک کی اور دربارِ کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کمشنر کے عہدے تک جا پہنچے۔ 17 اپریل 1935ء کو لاہور میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

ادبی خدمات اور طرزِ تحریر:-

صاحبزادہ نور الٰہی ~~اور محمد عمر~~ بچپن سے ہی ذہین تھے۔ آپ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کرکٹ بھی کھیلتے تھے۔ نور الٰہی اور محمد عمر اکثر دونوں ادبی کام ایک ساتھ کرتے تھے۔ اگرچہ ان دونوں کو ملازمت کے دوران بہت کم موقعے ایسے ملے جب یہ دونوں کسی ایک جگہ پر تعینات رہے ہوں جو ان کے لئے بہت ضروری تھا۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے جب کبھی کوئی کام کرنے کا فیصلہ کیا تو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے رابطہ کر لیتے تھے۔ انہوں نے جتنے بھی ادبی کام کئے وہ سب دونوں کے مشترکہ قلمی نام کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ دونوں کے تعلق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ منشی نور الٰہی کے انتقال کے بعد بھی صاحبزادہ محمد عمر اپنی ساری تحریریں مشترکہ قلمی نام سے ہی منظرِ عام پر لاتے رہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ "ناٹک ساگر" کی تالیف ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ڈرامے، افسانے، تنقیدی مضامین اور نظم پارے ریاستی اردو ادب کو آپ کی دین ہے۔

305-060 • WK 44 NOV 2014 01 Saturday

Notes prepared by Sheraz Ahmad Dar M.A. B.Ed. 7889726757

(خلاصہ)

"سیر چوتھے درویش کی"

یہ سبق سیر چوتھے درویش کی ہماری درسی کتاب "بہارستانِ اردو" سے لیا گیا ہے۔ اصل میں یہ تحسین کی "نوطرزِ مرصع" کی مشکل زبان کا ترجمہ "باغ و بہار" جو میر امن دہلوی نے لکھی ہے۔ اس میں چوتھا درویش اپنی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری بربادی اور خستہ حالی کی طرف نہ جائیے میں کوئی فقیر نہیں بلکہ چین کے بادشاہ کا بیٹا ہوں ہوش سنبھالنے سے پہلے میرے والد صاحب اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اور مرنے کے وقت میرے چچا یعنی اپنے بھائی سے وصیت کی کہ فی الحال امانت کے طور پر حکومت سنبھالئے اور میرے بیٹے کے بالغ ہونے پر تخت اس کے حوالے کیجئے اور اس کی شادی اپنی بیٹی روشن اختر سے کر دیجئے۔ وقت گزرتا گیا اور میں عیش و آرام سے زندگی کے دن گزارتا رہا کہ ایک دن محل کی ایک ادنیٰ نوکرانی نے مجھے تھپڑ مارا۔ اسی بہانے میرے والد کا ایک غلام باوفا جس کا نام مبارک تھا مجھے میرے چچا یعنی بادشاہ کے پاس لے گیا تاکہ بادشاہ کو مجھ پر رحم آ جائے اور وہ مجھے میرا حق واپس لوٹا دے۔ لیکن چچا نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ اس بات کو اگلے سال تک ٹال دیا۔ کچھ ہی دن بعد مجھے مبارک سے معلوم ہوا کہ میرا چچا میری جان کا دشمن بنا ہے تو میں نے روتے اور گھبراتے ہوئے مبارک سے کہا کہ وہ کسی طرح میری جان بچائے مجھے شادی اور سلطنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس غلام باوفا یعنی مبارک نے مجھے دلاسہ دے کر کہا کہ میں نے ایک تدبیر نکالی ہے اگر راس آئی تو ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔ تب میرے چچا کے پاس گیا اور اس کو یقین دلایا کہ وہ شہزادے یعنی مجھے دور جنگل میں لے کر مار ڈالے گا تاکہ کسی کو خبر نہ لگے۔ اسی بہانے مبارک نے مجھے اپنے ساتھ میرے والد محترم کی بیٹھنے کی جگہ لے لیا۔ کرسی اور فرش کو ہٹا کر زمین کھودنے لگا۔ زمین کھودنے پر ایک کھڑکی نمودار ہوئی جس میں زنجیر اور قفل لگا تھا۔ کھڑکی کے کھلنے کے بعد عمارت نظر آ گئی جس میں چار مکان نظر آ گئے۔ مکانوں کے دالانوں میں دس دس خیمے سونے کی زنجیروں میں لٹکے ہوئے تھے اور ایک حوض جواہر سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ ہر ایک خیمے کے اوپر ایک سونے کی اینٹ اور ایک بندر تھا انتالیس خیمے چاروں مکانوں میں تھے صرف ایک خم تھا جس پر نہ اینٹ اور نہ ہی بندر تھا۔ جب میں نے اس سارے عجیب و غریب قصے کے بارے میں مبارک سے دریافت کیا تو اس نے کہا تمہارے والد صاحب کو جنوں کے بادشاہ (ملک صادق) کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ وہ ہر سال ملک صادق کے پاس جاتا تھا اور ملک صادق تمہارے باپ کو ایک بندر جس کے تابع ایک ہزار دیو ہیں تحفے میں دیتا تھا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ جب تک ان بندروں کی تعداد چالیس نہ ہوں تب تک یہ کسی کام کے نہیں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے چالیسویں سال آپ کے باپ کا انتقال ہو گیا اس یہ سارا قصہ ادھورا رہ گیا۔

مبارک نے کہا اب میں آپ کو ملک صادق کے پاس لے جا کر اسکو تمہارے

Scanned with CamScanner

بابا کی دوستی یاد دلاکر اور تمہارے چچا کے ظلم وستم بیان کرکے چالیسواں بندر مانگ لوں گا۔ اسی ارادے سے ہم دونوں کچھ تحفے لیکر اُتر کی سمت ایک جنگل کی راہ لیے کر چلتے گئے۔ مسلسل ایک مہینے چلتے چلتے ایک دن مبارک نے میری آنکھوں میں سلیمانی سرمہ لگایا جس سے مجھے جنوں کے لشکر نظر آنے لگے۔ مبارک سے سب جن آشنا تھے اس لئے مبارک سے گلے مل کر مزاجیں کرتیں اور خیریت پوچھتے۔ بہرحال ملک صادق کے محل تک پہنچے۔ کھانے کی محفل چلی۔ فارغ ہوکر مبارک نے ملک صادق سے میرا تعارف کرایا اور میرا سارا قصہ بیان کیا۔ اس پر ملک صادق نے تامل کرکے کہا کہ واقعی شہزادے کے والد کے مجھ پر بہت احسانات ہیں لہٰذا ان احسانات اور دوستی کے سبب ایک شرط پر اس کو چالیسواں بندر دونگا اگر اس نے میرا کام بغیر کسی خیانت کے انجام دیا۔

— ٭ —

نہ کرنا لذت کی خواہش لیے گناہ کبھی
تیری ہر امر کا فرشتے حساب رکھتے ہیں
(غمگین ڈار)

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

اور مزاج دار لٹ گئی (خلاصہ)

"اور مزاج دار لٹ گئی" ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" سے ماخوذ ہے۔ اس ناول کے اہم کردار محمد عاقل۔ محمد عاقل کی بیوی (مزاج دار) حجن (ایک مکار عورت) اور زلفن ایک پڑوسن ہے۔

محمد عاقل اپنی بیوی (مزاج دار) کو باخبر کرتا ہے کہ شہر میں دلالہ آئی ہے جو گھر والوں کو لوٹ رہی ہے۔ اس لئے کسی اجنبی عورت کو گھر میں آنے نہیں دینا۔ مزاج دار ایک بے وقوف عورت تھی۔ اسے معلوم پڑا کہ گلی میں کوئی حجن (حاجی صاحبہ) آئی ہے، جو لوگوں کو تبرکات کی زیارت کراتی ہے۔ مزاج دار اپنی پڑوسن (زلفن) کے ذریعے حجن کو گھر بلواتی ہے۔ حجن مزاج دار کو بہت سی چیزیں دکھاتی ہے۔ مزاج دار نے نادِ علی اور سرمہ پسند کیا۔ وہ مزاج دار کو فیروزے کی ایک انگوٹھی مفت میں دیتی ہے۔ مزاج دار خوش ہوتی ہے۔ حجن تاڑ لیتی ہے کہ مزاج دار کو آسانی سے بیوقوف بنایا جا سکتا ہے۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے مزاج دار کا اعتماد حاصل کرتی ہے۔

دوسرے دن حجن ایک ریشمی ازار بند جس کی قیمت دو روپیہ سے کم نہ تھی، مزاج دار کو صرف چار آنے میں بیچتی ہے۔ شام کو مزاج دار کا خاوند (محمد عاقل) ازار بند دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس کی عقل پر لالچ کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی کی طرح اس بات سے متفق ہوا کہ حجن بیچنے کی ساری چیزیں پہلے اُن کے گھر لایا کرے گی۔ اس طرح حجن کا مزاج دار کے گھر آنا جانا جاری رہتا ہے۔ حجن مزاج دار کو اس طرح پھنساتی ہے کہ مزاج دار حجن کو اپنی ماں بنا لیتی ہے۔

حجن ایک دن مزاج دار کو نقلی موتیوں کا جوڑا پچاس روپیے میں بیچتی ہے۔ مزاج دار کے پاس پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ اس لئے حجن مزاج دار سے اپنے کانوں کی بالیاں بیچنے کو کہتی ہے۔ مزاج دار آمادہ ہو کر اپنے تمام زیورات لاتی ہے اور حجن موقع کا فائدہ اُٹھا کر مزاج دار سے کہتی ہے۔ ان زیورات کو خراب کر دیا ہے ان میں ڈورا ڈلوانے اور اُجلوانے کی ضرورت ہے۔ مزاج دار اپنے تمام زیورات ڈورا ڈلوانے اور اُجلوانے کے لئے حجن کے حوالے کرتی ہے۔ زلفن کو حجن کے ساتھ بھیجتی ہے مگر حجن کچھ دور چل کر زلفن کو مزاج دار کے گھر یہ کہہ کر واپس بھیج دیتی ہے کہ ناک کی کیلی گھر پر ہی رہ گئی۔ زلفن جب واپس مزاج دار کے پاس پہنچتی ہے تو اس دوران مکار حجن فرار ہو جاتی ہے۔ زلفن کے واپس لوٹنے پر وہاں دُور دُور تک حجن کا کوئی نام و نشان ہی نہ تھا۔ اس طرح حجن مزاج دار کو لوٹ لیتی ہے۔

عبرت (خلاصہ)

یہ افسانہ "عبرت" ہماری کتاب "بہارستانِ اردو" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف منشی پریم چند ہے۔ چونکہ عبرت کے معنی "نصیحت حاصل کرنا" کے ہیں اس لئے اس کا نام افسانے کے عین مطابق ہے۔ اس افسانے میں پریم چند نے بڑے دلکش انداز میں اس بات کا نقشہ کھینچا ہے کہ سماج میں عیاش، عیار، مکار اور رشوت خور لوگ اگرچہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزارتے ہیں لیکن انہیں اپنی بے ایمانی اور بے انصافی ہونے کے سبب ہمیشہ ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ سچائی، ایمانداری اور انسان دوستی کو اپنی زندگی میں کارفرما رکھتے ہیں وہ ہمیشہ عزت اور شہرت کی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔

افسانے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ پنڈت چندر دھر بلھورے رہنے والے اسکول میں بحیثیت مدرس کا کام کرتے تھے اور مشکل سے زندگی بسر کرتے تھے جبکہ ان کے پڑوس میں ٹھاکر اتی بل سنگھ ہیڈ کانسٹیبل اور منشی بیج ناتھ سیاہ نویس عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے۔ حالانکہ ان کی تنخواہ پنڈت جی سے زیادہ نہ تھی اور علم و لیاقت میں وہ لوگ پنڈت جی کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ ان دونوں کی ٹھاٹ دیکھ کر پنڈت جی اپنے پیشے سے بیزار تھے اور اپنی تقدیر کو ہمیشہ کوستے رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اپنا کام خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے اور دل و جان سے بچوں کو پڑھاتے اور کبھی بھی اپنے پیشے میں غفلت نہ کرتے تھے۔ ادھر ٹھاکر اتی بل سنگھ اور منشی بیج ناتھ بہت ہی نالائق رشوت خور اور بد دیانت تھے۔

ایک دفعہ ان دونوں نے پنڈت جی کو اجودھیا کی یاترا پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا۔ پنڈت چندر دھر اکیلے تھے مگر وہ دونوں اپنے عیال سمیت تھے۔ میلے کی وجہ سے بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ اسلئے بھیڑ میں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ پنڈت چندر دھر اور ٹھاکر اتی بل سنگھ ریل کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے جبکہ منشی بیج ناتھ دوسرے ڈبے میں۔ ٹھاکر اتی بل سنگھ کا سابقہ ریل کے ڈبے میں دو آدمیوں سے پڑا جنہوں نے جگہ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی بڑی حقارت اور ذلت آمیز لہجے میں بات کی۔ سامان پھینک کر اگلے ہی اسٹیشن پر اترنے کے لئے مجبور کر دیا۔ دوسری جانب منشی جی شراب کی زیادتی اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہیضہ، قے اور دست کے شکار ہو گئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے باہر نکالا۔ علاج و معالجہ کی تلاش میں اسپتال پہنچے تو کمپوڈر (چھوٹے لال) بہت ہی بے رخی سے پیش آئے۔ اور علاج کے لئے فیس وصول کرائی۔ منشی جی جلدی میں بکس ٹرین میں بھول گئے تھے لہٰذا زیور بیچ کر دوائی اور فیس کا انتظام کرنا پڑا۔ ٹھاکر اتی بل سنگھ اور منشی بیج ناتھ دونوں کو سفر کے دوران بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑی۔ اجودھیا پہنچ کر بھیڑ کی وجہ سے کہیں ٹھہرنے کو جگہ نہ ملی۔ مجبوراً کھلے میدان میں ڈیرہ جمانے والے ہی تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ بچے، عورتیں بے حال ہو کر رونے لگے۔ اتنے میں ایک آدمی نمودار ہو گیا۔ اس نے پنڈت چندر دھر کو پہچان لیا اور سب لوگوں کو فوراً اپنے

Scanned with CamScanner

گھر لے گیا۔ ان کے کھانا پینے اور آرام کا انتظام کیا۔ خوب خاطر داری کی۔ تین دن
تک گھر میں ٹھہرایا اور خاطر داری میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اس سفر کے
واقعات نے پنڈت چندر دھر کو اپنے بیٹے کی نصیحت یاد دلائی۔ اپنے اس طالب
علم (کرپاشنکر) کی خدمت کی وجہ سے مزاج میں تبدیلی آ گئی اور وہ اپنے بیٹے
کو دل سے چاہنے لگے۔ اس کو اس بات کی تصدیق ہوئی کہ ایمانداری سب سے بڑی
چیز ہے۔ برائی کا انجام ذلت ہے اور سچائی و نیکی کا انجام ہمیشہ عزت و شہرت
ہے۔

Scanned with CamScanner

آسمان پھول اور لہو (خلاصہ)

آسمان پھول اور لہو "نور شاہ" کا تحریر کیا ہوا افسانہ ہے۔ اس افسانے کے دو اہم کردار ایک خاتون اور ایک معصوم لڑکا ہے۔ خاتون گھریلو ضروریات کی وجہ سے بازار جاتی ہے۔ وہاں ایک معصوم لڑکا کھلونے کے دکان کے سامنے دکان دار سے گڑیا بیچنے کی ضد کرتا ہوا نظر آیا۔ بچے کے ہاتھ میں کچھ گنتی کے پیسے اور دوسرے ہاتھ میں گڑیا تھی مگر دکان دار گڑیا بیچنے سے انکار کرتا ہے۔ یہ دیکھ خاتون وہاں رک جاتی ہے۔ لڑکا خاتون سے مایوسی کی حالت میں یہ سوال کرتا ہے کہ کیا آنٹی میں ان پیسوں سے یہ گڑیا نہیں خرید سکتا۔ یہ گڑیا خریدنا میرے لئے بہت ضروری ہے اس کو مجھے اپنی دیدی کو ماں کے ہاتھوں بھیجنا ہے جو آسمانوں میں چلی گئی ہے۔ میرے ابو کا کہنا ہے کہ بہت جلد میری ماں بھی آسمانوں میں چلی جائے گی۔ میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ مجھے اتنے پیسے چاہیئے جن سے میں اپنی دیدی کے لئے گڑیا اور ماں کے لئے سفید پھول خرید سکوں کیونکہ میری ماں کو سفید رنگ کے پھول بہت پسند ہیں۔

خاتون بچے سے پیسے اپنے جادوئی پرس میں ڈالنے کو کہتی ہے اور دکان دار سے گڑیا اور سفید پھولوں کا گلدستہ پیک کرنے کو کہتی ہے۔ دکان دار سے گڑیا اور پھول لے کر قیمت وصول کی اور بچے کو اپنے پیسے واپس دیکر کہتی ہے کہ اللہ میاں نے تمہاری دعا قبول کر لی۔ لڑکا گڑیا اور پھول ہاتھوں میں لے کر آنٹی سے جانے کی اجازت لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ابو نے کہا کہ میری ماں کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو آنٹی تب تک اس کو تکتی رہی۔

دو دنوں کے بعد جب خاتون اپنے کچن میں اخبار پڑھ رہی تھی اور اچانک اس کی نظر ایک مردہ تصویر پر پڑتی ہے۔ جس پر ایک خاتون کی لاش اور سامنے وہی گڑیا اور سفید پھولوں کا گلدستہ پڑا ہوا تھا۔ خون میں لت پت اس تصویر کے نیچے ایک تحریر لکھی ہوئی تھی کہ "حلیمہ بی بی جو چند دن پہلے اپنی بیٹی کے ہمراہ ورمل جا رہی تھی کہ بس اسٹینڈ کے قریب گرینیڈ پھٹ جانے کے سبب وہ شدید زخمی ہو گئی تھی۔ کل رات زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ بیٹھی اور اس کی بیٹی خالدہ جس کی عمر دس سالہ تھی موقع پر ہی جاں بحق ہو گئی۔

خاتون گھبراتے ہوئے اپنی نظریں اخبار سے ہٹا کر ادھر ادھر دیکھتی ہے۔ کہیں کوئی نہ تھا۔ ایسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی معصوم سا لڑکا آسمانوں کی جانب بھاگا جا رہا ہے۔

NOTES

— ✗ —

Scanned with CamScanner

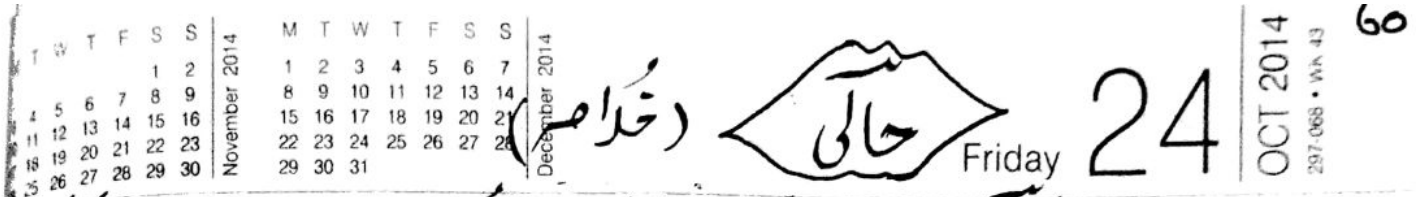

(خلاصہ) حالی

سبق بہ عنوان "حالی" ہماری درسی کتاب "بہارستانِ اردو" میں درج ہے۔ یہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کی شخصیت کے بارے میں ایک خاکہ زیبِ قرطاس کیا ہے۔ مولوی عبدالحق کی نظر میں مولانا حالی پاک سیرت، پاکیزہ خصائل کے مالک، خاکسار، ملنسار، خوش طبع، شگفتہ مزاج، فراخ دل، رقیق القلب، محبت و خلوص اور ہمدردی کے پیکر تھے۔ اُن میں تعصب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نام و نمود اور شہرت سے دور رہ کر کمزوروں اور بے کسوں کی بڑی مدد کرتے تھے۔ بڑے تو بڑے چھوٹوں کی تعظیم کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ اتنے دل غنی اور بے لوث تھے کہ انتہائی غریبی کے باوجود اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہیں کروائی اور اوپر سے غریبوں اور حاجت مندوں کی برابر مدد کرتے تھے۔ تنقید میں ذاتیات حسد اور بغض سے کام لینا منصبِ تنقید کے خلاف سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ تحریر و تقریر میں کیا نجی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی اُن کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی کی آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو اُس کو بُرا مانتے اور اُس کو نصیحت کرتے۔ اپنے اشعار میں کبھی کسی کی حقارت نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ لوگ آپ کی حقارت کرتے تھے تو جواب دینے کے بجائے صبر و تحمل سے کام لیتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

کیا پوچھتے ہو کیوں سب نکتہ چیں ہوئے چپ ؏
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

اشعار ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ شاعروں کی تکلف، تصنع اور بناوٹ سے بالکل پاک تھے۔ لیکن جس مجلس میں جاتے تھے ساری مجلس وجد میں آتی تھی۔ آپ نے اردو ادب کی ترقی کے لئے ہمیشہ دل و جان سے کوشش کی۔ غرض حالی جیسی عظیم المرتبہ اور بلند پایہ شخصیتیں آئے دن پیدا نہیں ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

خوشامد (خلاصہ)

خوشامد سر سید احمد خان کا ایک فصیح و بلیغ اور جامع انشائیہ ہے۔ خوشامد کے لغوی معنی "جھوٹی تعریف" یا "چاپلوسی" کے ہیں۔ اس انشائیہ میں سر سید نے خوشامد کو ایک ایسی روحانی بیماری قرار دیا ہے جو دل کی بے شمار مہلک اور جان لیوا بیماریوں کا سر چشمہ ہے۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اچھے بھلے انسان کے ذہن و قلب کو مفلوج (فالج کا شکار) کر کے رکھ دیتی ہے۔ جس طرح اچھے باجے کی آواز اور اچھے گانے والا کا راگ انسان کے دل کو نرم کر دیتا ہے اسی طرح خوشامد پسند کے دل کو خوشامد اس قدر نرم کر دیتی ہے کہ پھر ہر قسم کی روحانی بیماری اس دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسان کا بدن ناپاک اور غلیظ مادہ پیدا ہونے کے بعد ہر قسم کے وبائی اثر کو قبول کرتا ہے۔ شروع شروع میں یوں ہوتا ہے کہ ہم اپنی خوشامد یا تعریف خود کرتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اوروں کی خوشامد ہم پر حاوی ہو جاتی ہے اور جو محبت اور مہربانی ہم خود پر کرتے ہیں وہ اپنے خوشامدیوں پر کرنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنے خوشامدیوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ خوشامد پسند اپنے اندر ان اوصاف کو دیکھنے کا خواہشمند رہتا ہے جو حقیقت میں اس کے اندر موجود نہیں ہوتے۔ اور وہ ایسی باتیں سننے کا طلبگار رہتا ہے جن سے اس کا نفس موٹا اور اس کی جھوٹی انا کو تسکین ملے اسلئے وہ خوشامدیوں کے ساتھ محبت رواداری اور حسنِ سلوک کرنے لگتا ہے۔ اس کی عقل اندھی ہو جاتی ہے اور خوشامدیوں کا مکر و فریب اس کی بیمار طبیعت پر بالکل غالب آجاتا ہے۔ البتہ جس طرح جھوٹی تعریف انسان کے اندرون کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے اسی طرح جائز، سچی اور مناسب تعریف انسان کے باطن کو سنوارتی اور نکھارتی ہے اور اس کی روحانیت کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ نیز اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ بالکل عمدہ خوشبو کی طرح جو اچھے دماغ پر لائق اثر ڈالتی ہے اور کمزور دماغ کو پریشان کر کے رکھ دیتی ہے لہٰذا ہمیں خوشامد کی اس بری عادت سے بالکل پرہیز کرنا چاہیئے تاکہ ہماری زندگی بہت سی قلبی بیماریوں سے محفوظ رہ سکے اور دوسروں کو بھی اس بری عادت سے حتی الامکان دور رہنے کی تلقین کرنی چاہیئے۔

اقبال اور انسانیت (غلام)

یہ سبق نامور اور مستند ماہر تعلیم خواجہ غلام السیّدین کی کتاب "آندھی میں چراغ" سے ماخوذ ہے اس میں خواجہ صاحب اقبال کی شاعری اور فلسفے کے مرکزی خیال کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقبال کا تصورِ انسانیت کیا ہے اور اُن کی نظر میں مومنِ کامل کون ہے۔ دراصل علامہ اقبال ایسے انسان کی تلاش میں ہے جو اُن تمام نقلی اور مصنوعی دیواروں کو یک قلم مٹا دیں جس کو انسانیت کے دشمنوں نے اپنے ذلیل مقاصد کے خاطر قوم، نسل، رنگ، ذات پات اور زندگی کے حسین نقشے کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ایسا انسان جو عشق کے جادو کو عقل کی تلوار پر ترجیح دیتا ہے کیونکہ محض علم اور سائنس اپنی اہمیت، افضلیت اور عظمت ہونے کے باوجود انسان کو ہیروشیما اور ناگاساکی کے جہنم میں بھی پہنچا سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے سامنے موجودہ زمانے میں عراق، افغانستان، فلسطین، برما، کشمیر، نیوزی لینڈ اور بہت ساری جگہوں کے دلخراش واقعات موجود ہیں۔

علامہ اقبال ایک روادار فراخدل انسان دوست اور اُس ہمدرد انسان کی تلاش میں ہے جو تعصب، تنگ نظری اور نسلی حسد کے جالے صاف کرکے دل و دماغ پر پڑے پردوں کو ہٹا کر انسانوں کو اُن کے حقیقی روپ میں دیکھ سکے۔ وہ انسان جو انسان کے کام بگاڑنے کے بجائے سنوارنے میں صلاحیت اور قوت صرف کرے۔ وہ انسان جو اپنی اور دوسروں دونوں کی خودی کا احترام کرتا ہو۔ نہ اپنی خودی کو پامال ہونے دیتا ہو نہ دوسروں کی خودی کو ٹھیس پہنچاتا ہو بلکہ ایک جھوٹی انا رکھنے کے بجائے ایک سچا روادار ہو۔ علامہ اقبال اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ میری مثنوی کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں بلکہ اصل میں میں ایک بہتر انسانی سماج کی تلاش میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اس سلسلے میں میں اسلامی معاشرتی نظام کو کیسے بھول سکتا ہوں جس کا مقصد ہی نسل، ذات پات اور رنگ کے فرق کو یکسر مٹا دینا ہے۔

اقبال کی پوری شاعری میں محبت، رواداری اور انسان دوستی کا جذبہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اقبال ہر انسان کو بندۂ مومن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال کا یہ پیغام نہ نیا ہے اور نہ انوکھا بلکہ یہ باتیں پہلے بھی کئی دانش مندوں نے دہرائی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اس کے بندوں کی خدمت کرکے دکھاؤ۔ مہاتما بدھ کا قول ہے کہ "تم دشمن کو دشمنی کے ذریعے کبھی زیر نہیں کر سکتے محبت اور دوستی سے ہی اسے فتح کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک ابدی قانون ہے۔" حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم دی کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے محبت سے پیش آؤ اور برائی کا بدلہ نیکی سے دو۔ مصنف کی نظر میں جس طرح قدرت کے نظارے ہر انسان کے لیے سرمایہ ہے اسی طرح گوئٹے، حافظ، ٹیگور، افلاطون، سقراط جیسی شخصیتیں تمام انسانوں کے لیے سرمایہ ہے۔ اقبال کو ہندوستان اور پاکستان اپنا شاعر مانتے ہیں لیکن اقبال کا پیغام ان ممالک کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے لیے ہیں کیونکہ اقبال جیسے لوگ آئے دن

— — پیدا نہیں ہوتے — —

Scanned with CamScanner

بور کے لڈو (خلاصہ)

ڈراما "بور کے لڈو" ہماری درسی کتاب "بہارستان اردو" سے لیا گیا ہے۔ یہ محمد عمر نور الٰہی کا تحریر کیا ہوا ڈراما ہے۔ اس میں ڈراما نگار بہت ہی دلچسپ انداز میں درختوں کی بے دریغ کٹائی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ جس سے ماحول کا توازن بگڑنے کا خطرہ لاحق ہے۔۔۔ نیز اس سے یہ نصیحت بھی ملتی ہے کہ نادان، جاہل اور جلد بازی سے کام لینے والے لوگ کبھی وقت اور موقعے کا فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں۔

ایک بیوقوف لکڑ ہارا روز جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاتا ہے اور اس کو بیچ کر گزارہ کرتا ہے۔ ایک دن جنگل سے جلدی واپس خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں اور کیچڑ بھرے پیروں سمیت گھر میں داخل ہوتے ہیں اس پر اس کی بدتمیز بیوی سخت ڈانٹتی ہے اور بجائے کھانا کھلانے کے برا بھلا کہتی ہے۔ ایک طرف بدمزاج بیوی بیوقوفانہ سوالات کرتی ہے تو دوسری طرف بے وقوف شوہر احمقانہ جواب دیتا ہے۔ سویرے گھر واپس لوٹنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے شوہر نے کہا کہ جب میں ایک بڑا پیڑ کاٹنے لگا تو وہاں سے ایک آواز آئی "مجھے مت کاٹو، میں تمہیں انعام دوں گا" میں گھبرا کر بھاگ گیا۔ یہ ماجرا سن کر بیوی نے کہا "ارے احمق درخت بھی کہیں باتیں کرتا ہے"۔ دونوں کے درمیان زبان کے تیر چل ہی رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی کہ دروازہ کھولو میں انعام لے کر آیا ہوں۔ دونوں دروازے کی طرف دوڑ کر ایک بوڑھے میاں کو اندر لے آتے ہیں۔ بوڑھے میاں نے کہا کہ مجھے "ہریاول" کے بادشاہ نے آپ کے پاس آپ کی تین مرادیں پوری کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ مرادیں مانگنے پر میاں بیوی دونوں میں تو تو میں میں شروع ہوتی ہے۔ بیوی دولت مانگنے پر زور دیتی ہے تو شوہر بھوک کی شدت کی وجہ سے بور کا گرم لڈو مانگتا ہے۔ بیوی کے لاکھ سمجھانے پر بھی شوہر مراد مانگتا ہے تو بور کا لڈو ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ بیوی غصے میں لڈو شوہر کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے تو بیوقوف شوہر ناراض ہو کر دوسری مراد یہ مانگتا ہے کہ لڈو اس کی بیوی کی ناک سے چپک جاتا ہے کہ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ اب بیوی کی عاجزی اور مجبور کرنے پر شوہر تیسری مراد یہ مانگتا ہے کہ لڈو اس کی بیوی کی ناک سے چھوٹ جائے۔ اس طرح تینوں مرادیں اکارت ہو جاتی ہیں اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ بوڑھا آدمی جاتے وقت ہنستے ہنستے دونوں سے کہتا ہے کہ تم جلد باز، لالچی اور بیوقوف نکلے۔ دراصل مانگنے کے لائق صرف ایک ہی چیز تھی اور وہ چیز تھی "خوشی"۔ اگر ہاتھ لگ جائے تو پھر عیش ہی عیش ہے۔ لہٰذا ہمیں کبھی بھی کہیں بھی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ صبر و تحمل سے کام لے کر موقع کا فائدہ اٹھانا چاہئے۔

Notes prepared By Mungeem Bhat Dar. 7889726757

Scanned with CamScanner

٭ حصہ نثر ٭

٭ سوالات ٭

سیر چوتھے درویش کی

سوال 1:- فرش پر سے پتھر ہٹانے کے بعد شہزادے نے زمین کے اندر کیا دیکھا؟

جواب:- فرش پر سے پتھر ہٹانے کے بعد شہزادے نے زمین کے اندر ایک عمارت اور چار مکان دیکھے۔ ہر ایک دالان میں دس دس مٹکے سونے کی زنجیروں سے لٹکے ہوئے تھے۔ ہر ایک مٹکے کی گولی کے منہ پر ایک سونے کی اینٹ اور ایک بندر رکھا ہوا تھا۔ چاروں مکانوں میں انتالیس گولیاں تھی شہزادے نے صرف ایک مٹکا ایسا دیکھا جس پر نہ اینٹ تھی اور نہ بندر اور ایک کنواں دیکھا جو جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔

سوال 2:- ملکِ صادق کون تھا اور شہزادے کے ساتھ اُن کا کیا رشتہ تھا؟

جواب:- ملکِ صادق جنوں اور پریوں کا بادشاہ تھا۔ ملکِ صادق شہزادے کے والدِ مرحوم کے گہرے دوست تھے۔ بادشاہ اس کے پاس اکثر جایا کرتا تھا اور وہاں سے قیمتی تحائف لایا کرتا تھا۔

سوال 3:- شہزادے کے چچا کے لئے کیوں کہا گیا کہ وہ "بجائے ابوجہل" کے تھا؟

جواب:- شہزادے کے چچا کو بجائے ابوجہل اس لئے کہا گیا کیونکہ وہ شہزادے کی جان کا دشمن تھا اور اس کا تاج و تخت اس سے چھیننا چاہتا تھا۔ ابوجہل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا وہ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں دیتا۔ شہزادے کا چچا بھی مثلِ ابوجہل کے تھا۔

Scanned with CamScanner

اور مزاج دار لٹ گئی

سوال 1:- لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے حجن کون کون سی چیزیں اپنے پاس رکھتی تھی؟

جواب:- لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے حجن طرح طرح کے تبرکات اور مختلف قسم کی چیزیں جیسے، تسبیح، خاکِ شفا، زمزمیاں، مدینہ منورہ کی کھجوریں، کوہِ طور کا سرمہ، خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا، عقیق البحر، نادِ علی اور پنج سورے وغیرہ اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔

سوال 2:- حجن نے مزاج دار سے قیمت لئے بغیر اس کو فیروزے کی انگوٹھی کیوں دی؟

جواب:- حجن مزاج دار کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اور خود کو ایک ہمدرد عورت ثابت کرنا چاہتی تھی اسلئے مزاج دار کو فیروزے کی انگوٹھی مفت میں دیتی ہے۔

سوال 3:- مزاج دار بہو کو بے وقوف بنانے کے لئے حجن نے کیا کیا؟

جواب:- حجن نے مزاج دار کو بے وقوف بنانے کے لئے مختلف قسم کی چیزیں سستے میں دے دی ایک ازار بند چار آنے میں ایک انگوٹھی اور دو لونگیں مفت میں دی جس کی وجہ سے مزاج دار کو حجن کی اپنائیت کا احساس ہوا۔

سوال 4:- محمد عاقل حجن کی چال کیوں نہ سمجھ سکا؟

جواب:- محمد عاقل اگر چہ عقل مند اور چالاک آدمی تھا مگر طمع اور لالچ کی وجہ سے اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا اور وہ حجن کی چال سے بے خبر رہ گیا۔

سوال 5:- حجن مزاج دار کے زیورات لوٹ لینے میں کس طرح کامیاب ہو گئی؟

جواب:- حجن جو ایک مکارہ عورت تھی۔ جھوٹے موتیوں کی ایک جوڑی مزاج دار بہو کو پچاس روپے میں دی مگر مزاج دار کے پاس روپیہ نہ تھے تو حجن نے پرانے زیورات بیچنے کو کہا۔ جب مزاج دار نے زیورات کا صندوقچہ لایا تو حجن نے کہا میل سے یہ سارے زیورات خراب ہو گئے۔ لاؤ میں انہیں ڈورا ڈلوا کے اور اجلوا کے لاؤں گی۔ مزاج دار حجن کے اس فریب میں آ کر زیورات اس کے حوالے کرتی ہے اور ایک نوکرانی زلفن کو بھی ساتھ بھیجتی ہے۔ حجن زلفن کو ناک کی کیل کے بہانے واپس بھیجتی ہے اور خود زیورات لے کر فرار ہو جاتی ہے اور مزاج دار پوری طرح سے لٹ جاتی ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

عبرت

سوال 1:- پنڈت چندر دھر اپنے پیشے سے کیوں بیزار تھے؟

جواب:- پنڈت چندر دھر ایک اپر پرائمری اسکول کے استاد تھے۔ ان کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہانہ تھی جس سے گھر کا گزارا مشکل سے ہو پاتا تھا۔ اس کے برعکس ان کے دو پڑوسی داروغہ جی اور منشی جی پنڈت جی کے مقابلے میں اس سے بھی قلیل تنخواہ پر بھی زندگی آرام سے گزارتے تھے۔ علم و لیاقت میں وہ لوگ پنڈت جی کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ وہ لوگ ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ پنڈت جی ان کی یہ ٹھاٹ دیکھ کر اپنی تقدیر پر کوستے تھے اور اپنے پیشے سے بیزار تھے۔

سوال 2:- داروغہ جی کا پنڈت چندر دھر کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا؟

جواب:- داروغہ جی پنڈت جی کے پڑوسی تھے۔ وہ ہمسائیگی کے جھوٹے بہانے کبھی کبھی سیر آدھ سیر دودھ اور سبزیاں وغیرہ پنڈت جی کو بھیجتے تھے اس کے بدلے میں پنڈت جی کو داروغہ جی کے دو بچوں کو پڑھانا پڑتا تھا۔ گویا داروغہ جی کا پنڈت جی کے ساتھ جو برتاؤ تھا وہ محض خودغرضی پر مبنی تھا۔

سوال 3:- دوران سفر داروغہ جی کے ساتھ پیش آیا واقعہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

جواب دوران سفر داروغہ جی اور پنڈت جی ریل کے جس ڈبے میں سوار تھے اس میں چار آدمی پہلے سے ہی بیٹھے تھے۔ دو بیٹھے تھے اور دو لیٹے تھے۔ داروغہ جی نے ان لوگوں سے کڑکی لہجے میں جگہ دینے کے لئے کہا۔ لیٹا ہوا مسافر داروغہ سے کہتا ہے کہ یہ تھانہ نہیں ہے ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے اس مسافر سے داروغہ نے پچیس روپے جرمانہ کے لئے تھے لہٰذا اس نے جگہ نہ دی۔ دوسرا مسافر بولا کہ مجھے کیوں نہیں اٹھاتے۔ جب اس سے جگہ مانگی اس نے بھی داروغہ کی بے عزتی کی کیونکہ اس کو بھی داروغہ نے ایک بار میلے میں مارا تھا۔ جیسے تیسے وہ تیسرے اسٹیشن پر پہنچے داروغہ نے بیوی بچوں کو ریل سے اتارا تو ان دو مسافروں نے داروغہ جی کا سامان باہر پھینک دیا جب داروغہ اترنے لگے تو اسے زور سے دھکا دیا اور وہ بے چارہ الٹے منہ پلیٹ فارم پر گر پڑا۔

سوال 4:- کرپاشنکر نے پنڈت جی، داروغہ جی اور منشی جی کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

جواب:- کرپاشنکر جو پنڈت کا پرانا شاگرد تھا۔ اس نے اجودھیا میں پنڈت جی، داروغہ جی اور منشی جی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ لوگ تین دن تک کرپاشنکر کے ہاں رہے۔ واپس نکلنے پر کرپاشنکر اسٹیشن تک ان کے ساتھ آیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے پنڈت جی کے قدم چھوئے اور کہا کہ کبھی کبھی مجھے یاد کیا کیجئے۔

Scanned with CamScanner

سوال 5:۔ پنڈت چندردھر کو اپنے پیشے کی عظمت کا احساس کس طرح ہوا؟

جواب:۔ پنڈت جی نے جب دورانِ سفر پیش آنے والے واقعات پر غور کیا۔ گاڑی میں داروغہ جی کی رگڑ جھگڑا اور بے عزتی، منشی جی کے ساتھ ہسپتال میں چوکھے لال کا برا سلوک اور اجودھیا میں کرپاشنکر کی عزت احترام اور محبت بھرا سلوک کرنا۔ جب پنڈت جی نے تینوں واقعات کا موازنہ کیا تو کرپاشنکر کی عزت، احترام، شرافت اور مہمان نوازی کا دل پر خاصا اثر ہوا جس سے پنڈت جی کو اپنے پیشے کی عظمت کا احساس ہوا اور اس کی اہمیت کے دل سے قائل ہوئے۔

سوال 6:۔ اس افسانے کا نام "عبرت" کیوں رکھا گیا؟

جواب:۔ عبرت کے معنی ہے "نصیحت حاصل کرنا"۔ پنڈت جی جو پیشے سے ایک استاد تھے۔ اپنے پیشے سے ہمیشہ ناراض تھے کیونکہ ان کی تنخواہ بہت قلیل تھی۔ جب کہ اس کے دو پڑوسی رشوت لے کر زندگی عیش و عشرت سے گزارتے تھے۔ پنڈت جی ان کی شان و شوکت پر رشک کرتا تھا۔ لیکن اجودھیا کے سفر کے دوران دونوں رشوت خوروں کا جو حشر ہوتا ہے اور کس طرح لوگ ان دونوں رشوت خوروں سے نفرت کرتے ہیں یہ سارا منظر دیکھ کر پنڈت جی کو عبرت ہوئی کہ وہ اپنے پیشے کے متعلق کیا سے کیا غلط سوچ رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کا نام "عبرت" رکھا گیا ہے

Scanned with CamScanner

آسمان، پھول اور لہو

سوال 1:۔ دُکان دار لڑکے کو گڑیا کیوں نہیں بیچتا تھا؟

جواب:۔ دکاندار لڑکے کو گڑیا اسلئے نہیں بیچتا تھا کیونکہ اس کے پاس اُتنے پیسے نہیں تھے جن سے وہ اس گڑیا کو خرید سکتا تھا۔

سوال 2:۔ لڑکے کے لئے گڑیا کا خریدنا کیوں ضروری تھا؟

جواب:۔ ~~لڑکیا~~ لڑکے کے لئے گڑیا کا خریدنا ضروری اسلئے تھا کیونکہ اس کی بہن کو گڑیا بہت پسند تھی۔

سوال 3:۔ لڑکا ڈیوی کو گڑیا کس کے ہاتھ بھیجنا چاہتا تھا؟

جواب:۔ لڑکا ڈیوی کو گڑیا اپنی ماں بی بی حلیمہ کے ہاتھوں بھیجنا چاہتا تھا۔

سوال 4:۔ افسانے میں موجود "آنٹی" کے کردار پر حرف پانچ جملے لکھئے؟

جواب:۔ افسانے میں موجود ~~کا~~ آنٹی ایک نیک خاتون ہوتی ہے۔ وہ ایک رحم دل انسان ہوتی ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت ہوتی ہے۔ وہ اخبار پڑھنے کی بہت شوقین ہوتی ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتی ہے۔

سوال 5:۔ لڑکے کی کون سی دُعا اللہ نے قبول کرلی؟

جواب:۔ لڑکے کی ایک بڑی آرزو اور تمنا تھی کہ ~~وہ~~ اس کے پاس اتنے پیسے ہو کہ وہ اپنی ماں کے لئے سفید پھول اور بہن کے لئے ایک گڑیا خرید سکے۔ یہی آرزو، تمنا اور دُعا اللہ نے اس کی آنٹی کے ذریعے پوری کی۔

سوال 6:۔ لڑکے کی ماں اور بہن کا نام کیا تھا؟

جواب:۔ لڑکے کی ماں کا نام بی بی حلیمہ اور بہن کا نام خالدہ تھا۔

سوال 7:۔ اس افسانے کا نام "آسمان، پھول اور لہو" کیوں رکھا گیا ہے؟

جواب:۔ اس افسانے کا نام "آسمان، پھول اور لہو" اس لئے رکھا گیا کیونکہ اس میں ان تینوں چیزوں کا ذکر موجود ہے۔

Scanned with CamScanner

٭ حالی ٭

سوال 1:۔ قومی اتحاد کے بارے میں مولانا حالی کا کیا خیال تھا؟
جواب:۔ مولانا حالی قومی اتحاد کے بڑے قائل تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم لڑائی کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انہیں بہت افسوس ہوتا تھا۔ وہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سے کسی فرقے کی بھی دل آزاری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے چاہنے والوں کو بھی قومی اتحاد کی تلقین کرتے تھے۔

سوال 2:۔ مولانا حالی نے عملی میدان میں کون سی دو یادگاریں چھوڑی ہیں؟
جواب:۔ مولانا حالی نے عملی میدان میں اپنی دو یادگاریں چھوڑی ہیں ایک تو انہوں نے اپنے وطن پانی پت میں ایک مدرسہ قائم کیا جو اب حالی ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہے اور دوسری یہ کہ ایک اورینٹل لائبریری قائم کی جس سے پانی پت والوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔

٭ خوشامد ٭

سوال 1:۔ خوشامد کو بدتر چیز کیوں کہا جاتا ہے؟
جواب:۔ خوشامد کو بدتر چیز اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ تمام بیماریوں کی جڑ ہے۔ یہ ایک ایسا خطرناک اور گھٹیا جذبہ ہے جو انسان کے دل و دماغ کو بے کار کر دیتا ہے۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے والا انسان اپنی اصلیت بھول جاتا ہے۔

سوال 2:۔ خوشامدی میں کیا کیا عیب ہوتے ہیں؟
جواب:۔ خوشامدی میں بہت سارے عیب ہوتے ہیں۔ اس میں انسان اپنی جھوٹی تعریفیں سننے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس میں مکاری اور فریبی ہوتی ہے۔ خوشامدی سے انسان خودغرض اور گھمنڈی بن جاتا ہے اور خوشامدی سے انسان کاہل، سست اور نکما بن جاتا ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

اقبال اور انسانیت

سوال 1:۔ صالح زندگی کی تعمیر کے لئے اقبالؒ نے کس بات کو ضروری قرار دیا ہے؟
جواب:۔ صالح زندگی کی تعمیر کے لئے اقبالؒ نے دو چیزوں کو لازمی قرار دیا ہے وہ یہ کہ ایک تو اپنی خودی کا احترام کرنا بالکل اسی طرح دوسروں کی خودی کا بھی احترام کرنا۔

سوال 2:۔ "خودی" سے کیا مراد ہے؟
جواب:۔ خودی کے معنی "اپنا آپ" یا "معرفت نفس" کے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو پہچاننا۔ کیونکہ معرفت نفس سے ہی انسان کو معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جو کسی بھی قیمت پر بیچی نہیں جا سکتی۔

سوال 3:۔ دنیا آج کل کس خطرے کی زد میں ہے؟
جواب:۔ دنیا آج کل تنگ نظری، نسلی حسد اور تعصب کے جال میں پھنسی ہوئی ہے

سوال 4:۔ اقبالؒ کی شاعری کے بنیادی فکری پہلو کیا ہیں؟
جواب:۔ اقبال کی شاعری کا بنیادی فکری پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کے دروازوں کو کھول دے تاکہ تنگ نظری اور نسلی حسد رفع ہو جائے اور ایک انسان ایک دوسرے کا خون پینے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ دکھ سکھ میں شریک رہے۔

سوال 5:۔ انسان اور انسانیت کی فلاح کے لئے اقبال کا پیغام کیا ہے؟
جواب:۔ انسان اور انسانیت کی فلاح کے لئے اقبال کا یہ پیغام ہے کہ انسان قوم، نسل، رنگ اور ذات پات جیسے اختلافات سے پاک ہو۔ نسلی حسد، نفرت اور تنگ نظری کی دیوار ہی نہیں انسان اور قوم کے لئے بہتر نہیں ہیں۔ اس کے برعکس مشرق اور مغرب کے جھگڑے سے اگر دل و دماغ پاک ہو جائے تو یہی پوری انسانیت کے لئے فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔

سوال 6:۔ جملوں میں استعمال کیجئے:۔

NOTES

خیال:۔ اپنی عزت کا خیال رکھنا چاہیے۔
تلاش کرنا:۔ آج بہتر روزگار تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔
ٹھیس:۔ کسی کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہیے۔
حامی:۔ اللہ ہر مسلمان کا حامی ہے۔

Scanned with CamScanner

بور کے لڈو

سوال 1:- جنگل میں لکڑی کاٹتے ہوئے لکڑ ہارے نے کس کی آواز سنی اور اس نے اس سے کیا کہا؟

جواب:- جنگل میں لکڑی کاٹتے ہوئے لکڑ ہارے نے درخت کی آواز سنی۔ اور اس نے اس سے کہا کہ "مجھے مت کاٹو میں تمہیں انعام دوں گا۔"

سوال 2:- گھر آنے پر لکڑ ہارے اور اس کی بیوی میں کیوں تو تو میں میں ہونے لگی؟

جواب:- گھر آنے پر لکڑ ہارا میلے کچیلے پیروں سے بیوی کی صفائی غارت کر دیتا ہے اور بیوی اسے جھاڑو سے مارتی ہے لکڑ ہارا لکڑی کا گٹھا نیچے پھینک دیتا ہے اور اسے اٹھانے کے لئے ان کے درمیان تو تو میں میں ہوتی ہے۔

سوال 3:- بوڑھے نے لکڑ ہارے کے گھر آکر اس سے کیا کہا؟

جواب:- بوڑھے نے لکڑ ہارے کے گھر آکر اس سے کہا کہ "درخت نہ کاٹنے پر پریاول کے بادشاہ نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ انعام کے طور پر تمہاری منہ مانگی تین مرادیں پوری کی جائیں۔

سوال 4:- لکڑ ہارے نے بور کا لڈو کیوں مانگا؟

جواب:- لکڑ ہارے کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اس لئے اس نے بور کا لڈو مانگا۔

سوال 5:- لکڑ ہارے کی بیوی اسے کیا مانگنے کے لئے بار بار کہتی رہی؟

جواب:- لکڑ ہارے کی بیوی اسے بار بار دولت مانگنے کے لئے کہتی رہی۔

سوال 6:- بوڑھے کے نزدیک سب سے بڑی دولت کیا تھی؟

جواب:- بوڑھے کے نزدیک سب سے بڑی دولت ہنسی یعنی خوشی تھی۔

سوال 7:- اس ڈرامے سے آپ کو کیا سبق حاصل ہوتا ہے؟

جواب:- اس ڈرامے سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہمیں جنگلات کی حفاظت کرنی چاہئے اور کسی بھی کام میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے۔

محاورات اور جملے:-

محاورہ	معنی	جملے
1۔ پاؤں دھو کر پینا	عزت/خدمت کرنا	اپنے والدین اور استاد کے پاؤں دھو کر پینے چاہئے۔
2۔ ڈر کے مارے کانپنا	گھبرانا، ڈر جانا	دھماکے کی آواز سن کر بچے ڈر کے مارے کانپ گئے۔
3۔ منہ دھو رکھنا	کسی کام کے ہونے کی امید نہ رکھنا	تم فضول بکتے ہو اس لئے منہ دھو رکھو۔
4۔ خاک میں ملنا	برباد ہونا، مٹنا	چوری کرکے سلیم نے والدین کی عزت خاک میں ملا دی۔
5۔ کانٹے بونا	مشکل کھڑا کرنا	کسی کی راہوں میں کانٹے نہیں بونے چاہئے۔
6۔ بے سر پیر اڑانا	فضول باتیں کرنا	اس کو بے سر پیر اڑانے کی عادت ہے۔
7۔ پیٹ میں چوہے دوڑنا	بہت بھوک لگنا	میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

3 | 15 | 22

اُردو شعری اصناف

9 | 16 | 23

Notes Pepared By Gumgeen Sheraz Dar.M.A B.Ed. 7889726757

Scanned with CamScanner

غزل

معنی کے اعتبار سے غزل اس کلام کو کہتے ہیں جس میں عورتوں کے حسن و عشق کا ذکر ہو۔ غزل شاعری کی وہ قسم ہے جس میں عشق کی کہانی خود عاشق کی زبان سے بیان کی جائے۔ لیکن اصناف ادب میں غزل اس نازک صنف کا نام ہے جس میں عشق و محبت، حسن و جمال، گل و بلبل کے تذکرے، معشوق کے خد و خال کی تعریف، اس کے جور و ستم، بے توجہی، ہجر و فراق کی تڑپ، بے چینی، بے قراری، وصالِ محبوب کی تمنا، رقیب سے شکوہ اور شادی و غم کے مضامین اکثر و بیشتر بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو غزل نے بھی اپنے مزاج میں تبدیلی کو پسند کیا۔ اب ہجر و وصال کی دکھ بھری داستان کے ساتھ غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا ہو گئی تو فلسفہ حیات، مذہبیات، مسائلِ انسانی، دقیق خیالات (نازک یا باریک) اور سنجیدہ مضامین بھی غزل کے موضوعات بن گئے۔ جب غور سے دیکھا جائے تو غزل وہی ہے جو پہلے تھی وہی غزل جس کی ابتدا عربی سے ہوئی۔ وہاں سے نکل کر ایران پہنچی تو فارسی نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا

غزل کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کا ہر شعر دوسرے شعر سے مضمون یا معنی کے اعتبار سے جدا جدا ہوتا ہے۔ شاعر اس میں وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پہ گزرتی ہے۔ اور اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کی غزل کو پیش کرتے وقت غزل گو عام طور پر شیرین الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ غزل کو عموماً اپنی ہیئت کے اعتبار سے اردو شاعری کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ جو شعراء کافی مشاہدہ، گہرا خیال اور بلند نظر رکھتے ہیں کامیاب غزل گو ہو سکتے ہیں۔ غزل اردو شاعری کی سب سے زیادہ دلچسپ اور مقبولِ عام صنفِ سخن ہے۔ یہ غزل ہی ہے جس نے اردو شاعری کو عالمی شاعری کے لئے ہم پلہ بنا دیا۔

غزل کے پہلے شعر کو "مطلع" کہتے ہیں۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ، ہم ردیف اور ہم بحر ہوتے ہیں۔ غزل میں جس طرح مضامین کی کوئی قید نہیں اسی طرح اشعار کی بھی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ عام طور پر پانچ سے انیس اشعار تک کی غزلیں ہوتی ہے۔ لیکن کئی غزلوں میں اس سے زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ اگر غزل میں دوسرا مطلع بھی ہو تو اسے "حسن مطلع" یا "زیب مطلع" کہتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، اس شعر کو "مقطع" کہتے ہیں۔ غزل کے سب سے حسین شعر کو "شاہ بیت" یا "بیت الغزل" کہتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر کا معنی جداگانہ ہوتا ہے۔ کچھ غزلوں میں موضوع کی وحدت پائی جاتی ہے اور شاعر تسلسل کے ساتھ ایک ہی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرکے بیان کرتا ہے۔ اس طرح کی غزل کو "غزلِ مسلسل" کہتے ہیں۔ جس غزل میں ردیف نہ ہو صرف قافیے ہوں اس طرح کی غزل کو "غیر مردف" کہتے ہیں۔ وہ بحر اور ردیف جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے اسے غزل کی "زمین" کہتے ہیں۔

اردو ادب میں، خواجہ میر درد، میر تقی میر، مومن، غالب، اقبال، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی مشہور غزل گو شاعر ہیں۔

Scanned with CamScanner

اردو غزل کا آغاز و ارتقاء

غزل کی ابتداً عربی شاعری کے اثر سے ہوئی۔ عرب میں یہ "عذری" کے نام سے موسوم تھی۔ عرب میں ایک قبیلے کا نام عذری تھا جس میں یہ سب سے زیادہ مقبول ہوئی تھی اسلئے اس کو یہ نام پڑا۔ اور عذریوں کو ہی اس کا موجد بھی مانا جاتا ہے۔ اردو غزل گوئی کا آغاز دکن میں ہوا۔ اردو کے پہلے غزل گو شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ تھے جن کو کہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہا جاتا ہے۔ اُردو غزل کا باقاعدہ آغاز ولی دکنی سے ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو سر بلندی عطا کی۔ اس کے ہم عصروں میں شاہ حاتم، مظہر جانِ جاناں اور آبرو تھے۔ ان شعرا کے بعد غزل اپنے زریں (سُنہرے) دور میں داخل ہوتی ہے۔ میر تقی میر کو بادشاہِ غزل کہا جاتا ہے۔ اور استادِ شاعر مانا جاتا ہے۔

بقول غالبؔ:۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
سنا ہے اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا۔

میر کے ہم عصر سودا اور درد نے بھی غزل کی آبیاری کی۔ دہلی میں غزل گوئی کو عروج اس وقت حاصل ہوا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور داغ اور غالب نے غزل گوئی کو چار چاند لگا دئے۔ دہلی اجڑی تو شعراء حضرات نے لکھنؤ کی طرف کوچ کیا وہاں آصف الدولہ نے ان کی پذیرائی کی۔ یہاں انشاء، جرأت، آتش اور مصحفی وغیرہ نے غزل کی آبیاری کی۔ اور غزل کا فن ارتقائی منازل طے کرتا گیا۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد حالات نے کروٹ لی اور صحت مند معاشرتی اور ادبی شعور رکھنے والوں کو یہ خیال ہوا غزل کو اب اصلاح کی ضرورت ہے۔ بیسویں صدی میں اس میں بہت سی اصلاحات کی گئیں اس ضمن میں غالب، ذوق اور مومن نے بڑا کردار نبھایا۔ اس کی ہیئت بدلنے کے ناکام تجربے ہوئے لیکن اس کے موضوعات میں ہمہ گیری پیدا ہوئی۔

دورِ جدید میں غزل میں نیا رنگ اور آہنگ پیدا ہو گیا۔ یہاں پر ڈاکٹر اقبالؒ نے بھی اردو غزل میں فلسفہ پیش کرکے ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی ہے۔ جو اردو غزل کے بے حد ہمکنار تھا۔ اسطرح غزل اپنا ارتقائی سفر طے کرتے کرتے فیض، فراق، جذبی، ناصر کاظمی، پروین شاکر وغیرہ شعرا کے ہاتھوں میں آئی۔ اس کے بعد جموں و کشمیر کے غزل گو شعرا نے اس صنف کی طبع آزمائی کی۔ ان میں ~~بہت~~ رسا جاودانی، شہہ زور کشمیری، تنہا انصاری، میر غلام رسول نازکی، شوریدہ کاشمیری، عرش صہبائی، عابد مناوری نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ نئے غزل گو شعراء میں پیر تپال سنگھ بیتاب، رفیق راز، رخسانہ جبین، نذیر آزاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ جدید شعراء نے غزل کی ہیئت اور فن کو بگاڑنے کے نئے تجربے کرنے کی کوششیں کیں۔

Scanned with CamScanner

"نظم"

نظم کے لغوی معنی "موتی پرونا" "آراستہ کرنا" وغیرہ ہیں۔ نظم کے معنی "انتظام" "ترتیب یا آرائش" کے بھی ہیں۔ یوں تو ہر کلامِ موزوں کو نظم کہا جا سکتا ہے۔ لیکن عام اصطلاح میں نظم سے مراد وہ شعری اصناف اور اسالیب ہیں، جن میں کسی موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔ نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی قصہ، کوئی واقعہ، کوئی تجربہ، یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کیونکہ نظم کے معنی ہی پرونے اور یکجا کرنے کے ہیں۔ غزل کے علاوہ شاعری کی بیشتر اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی وغیرہ نظم کے دائرے میں آتی ہیں۔ نظم کی دیگر تمام قسموں اور صنفوں کے علاوہ خود "نظم" بھی ایک صنفِ شاعری ہے، جو نظم کی مروجہ قسموں ہی پر لکھی جاتی ہے، مگر اس میں اشعار یا بندوں کی کوئی قید روا نہیں رکھی جاتی۔ "نظم" کسی خاص موضوع پر ہوتی ہے خواہ وہ موضوع کچھ بھی ہو نظم کا میدان غزل سے زیادہ وسیع ہے۔ • نظم کسی ایک عنوان یا موضوع کی تفصیل ہوتی ہے۔ غزل کے جذبات لامحدود ہوتے ہوئے بھی محدود ہوتے ہیں اور ایک شعر میں کوئی ایک جذبہ ہی نظم کیا جا سکتا ہے۔ مگر نظم میں ایک موضوع کی اتنی وضاحت ہوتی ہے کہ شاعر اور سامع دونوں سیر ہو جاتے ہیں اور موضوع بھی تشنہ نہیں رہتا۔ غزل کے اشعار اگر شبنم کے حسین قطرات ہیں تو نظم زمین کو سیراب اور دلِ دہقاں کو شاداں و فرحاں کر دینے والی موسلا دھار بارش ہے۔ غزل کی تو ایک شکل مقرر ہے۔ اسی شکل کو ہیئت بھی کہا جاتا ہے۔ عام طور پر غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور اپنے الگ معنی دیتا ہے۔ اس کے برعکس نظم کی کوئی مقررہ شکل یا مقررہ ہیئت نہیں ہوتی۔ نظم کے لئے بہرحال ضروری ہے کہ خیال یا معنی کے اعتبار سے اس میں تسلسل ہو اور ایک شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا چلا جائے۔ نظم کے تمام اشعار موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اندر تدریجی (درجہ بدرجہ) ارتقاء پایا جاتا ہے۔ نظم کی ابتداء بچوں کی معصوم اور پیاری صورت کی طرح نہایت دلکش اور حسین ہوتی ہے، اس کا عروج اپنے اندر شباب کا جوش رکھتا ہے اور انجام و اختتام کی حسن کاری بھی قابلِ توجہ اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اور پھر سارے عشوے (معشوقانہ ادا، نخرے) ساری ادائیں، سارے جلوے ایک حسن کا تصور پیش کرتے ہیں۔ کثرت میں یہی وحدت نظم کو کامیاب بناتی ہے۔

اردو شاعری کے اندر اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے نظم نگاری کی ابتدا کی تھی مگر صحیح معنوں میں اس کی ترقی آزاد، حالی، اسمٰعیل اور درگا سہائے سرور کے ہاتھوں ہوئی اور اسے علامہ اقبالؒ نے اوجِ کمال تک پہنچایا۔ موضوع سے مصرعوں اور بندوں کی ترتیب کے اعتبار سے بھی دورِ قدیم میں نظم کا کچھ خاص اسالیب کا رواج رہا ہے۔ مثال کے طور پر مسدس، مخمس، ترجیع بند وغیرہ۔ ان قدیم اصناف اور اسالیبِ نظم کے فنی آداب اور اصول اتنے سخت تھے کہ ان میں کسی شاعر کو

NOTES

Scanned with CamScanner

اصلاح و ترمیم کی جرأت نہیں ہوتی تھی وہ ان ہی روایات اور ضابطوں کے پابند رہتے تھے لیکن جب زمانے اور زندگی نے کروٹ بدلی، ملک میں نئے حالات اور نئے مسائل پیدا ہوئے، سیاسی، سماجی اور تہذیبی میدان میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو اردو نظم کے روایتی اسالیب میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسطرح نظم جدید کا آغاز ہوا۔

جدید اردو نظم کے آغاز میں وارتقاء میں آزاد اور حالی نے اردو نظم کو چند بندھے ٹکے موضوعات کے دائرے سے نکال کر ہر طرح کے خیالات اور تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ لیکن انہوں نے ہیئت یا نظم کی ظاہری شناخت میں نئے تجربوں کو نہیں بلکہ مروجہ اور مسلمہ ہیئتوں کو ہی اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں شرر کے رسالہ "دل گداز" اور سر عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" نے جدید اردو نظم کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا اور نظم میں ہیئت کے نئے تجربے کیے گئے۔ مصرعوں کی نئی ترتیب، بند حصوں کی نئی تقسیم اور قافیہ ردیف کا نیا التزام سامنے آیا۔ اس دور میں شرر نے معریٰ اور نظم آزاد کے بھی تجربے کیے۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک اور مغرب کی بعض دوسری ذہنی اور ادبی تحریکوں کے اثر سے اردو نظم کے موضوعات اور ہیئتوں میں بھی خوشگوار تبدیلیاں ہوئی ترقی پسند تحریک کے شعراء میں مجاز، کیفی، فیض، جذبی، سردار جعفری، مخدوم اور ساحر لدھیانوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد برصغیر کی زندگی نئے تغیرات سے دوچار ہوئی۔ اس سے نئے حقائق اور نئے مسائل سامنے آئے۔ تو نوجوانوں میں شعور و احساس کی نئی لہر پیدا ہوئی۔ اس کا اثر شعر و ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ نظم پر بھی پڑا۔ اور نظم کی صنف میں ہر لحاظ سے نئے نئے تجربات کیے گئے۔

فنی ساخت کے اعتبار سے نظم جدید وہ نظم ہے جس میں شاعر پرانے ضابطے کی پابندی چھوڑ کر کسی مسلمہ اور مانوس یا نئی اچھوتی ہیئت میں اپنے تجربات اور خیالات کو ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش کرے۔

NOTES

فنی ساخت کے اعتبار سے نظم جدید کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ موضوع جدید لیکن ہیئت روایتی۔ ایسی نظمیں جو نفس موضوع کے تعمیری شعور کے اعتبار سے جدید ہیں لیکن ہیئت کے اعتبار سے جن میں کسی روایتی صنف یا اسلوب نظم مثلاً، مثنوی، مسدس، مخمس، یا قطعہ وغیرہ کی تقلید کی گئی ہو۔

Scanned with CamScanner

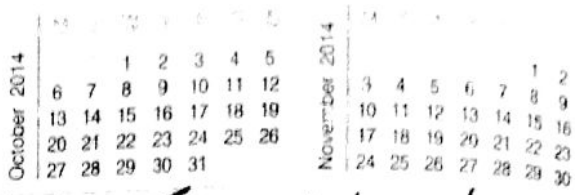

٢- ہیئت روایت سے ہٹ کر اور قوافی کے لحاظ سے اور بندوں وغیرہ کے لحاظ سے ایک نیا اور اچھوتا التزام کیا گیا ہو۔
ایسی نظمیں جن میں مصرعوں، بندوں، اور قوافی کی ترتیب کا ایک نیا اور اچھوتا التزام ہو یعنی ہیئت کے اعتبار سے جو کلاسیکی اسالیب نظم سے ہوں لیکن جن میں اوزان اور قوافی کے مروجہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو۔
٣- ایسی نظمیں جو فنِ شاعری یا نظم کے جدید یا مروجہ ضابطوں کی پابند نہیں ہو۔
ایسی نظم جس میں وزن کے تقاضوں کو پورا کیا جائے لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی نہ ہو۔ جیسے نظم معرّا کہتے ہیں۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی قسمیں:-

١- پابند نظم:- **
ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترتیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی جن کے بندوں کی ساخت مروجہ ہیئتوں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قوافی کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو لیکن ان کے تمام مصرعے برابر ہوں اور ان میں قوافی کا کوئی نہ کوئی التزام پایا جائے پابند نظم کہلاتی ہیں۔ مثلاً مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ۔
پابند نظم کی ہیئت غزل سے بہت کچھ ملتی ہے۔ کیونکہ اس میں کسی روایتی صنف کی تقلید ہوتی ہے۔ بحر اور قافیہ کی پابندی بھی ملتی ہے۔ یعنی پابند نظم میں بحر اور قافیہ کی سخت پابندی کی جاتی ہے۔ ہر مصرعے کا وزن ایک ہوتا ہے۔ قافیے کا التزام بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس میں سارا دارومدار مصرعوں کی ترتیب اور قافیے کی بندوبست پر ہوتا ہے جیسے:- غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی وغیرہ۔

***
٢- نظم معرّا:- ایسی نظم جس کے تمام مصرعے وزن کے لحاظ سے برابر ہوں مگر قافیہ نہ ہو نظم معرّا کہلاتی ہے۔ شروع میں اسے نظم غیر مقفیٰ یا بے قافیہ نظم سمجھا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے نظم عاری بھی کہا ہے۔ آج کل اسے نظم عاری ہی کہا جاتا ہے۔ اس میں ردیف اور قافیہ کی قید نہیں ہوتی البتہ بحر کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اسلئے مصرعے برابر اور ہم وزن ہوتے ہیں اسلئے شاعر کو آزادی ہوتی ہے۔ اگر انگریزی کے لئے کوئی خاص وزن مقرر ہے مگر اردو میں اس کی پابندی ممکن نہیں اسلئے مختلف اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔ انگریزی میں اسے بلینک ورس Blank Verse کہتے ہیں۔
مثال:- جاں نثار اختر کا یہ شعر:-

Scanned with CamScanner

۳۔ یہ تیرے پیار سے کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
اپنے سینے میں چھپائے تیرے دل کی دھڑکن
آج پھر تیری اداسے میرے پاس آئی ہے
کتنے لمحے کہ غم زیست کے طوفانوں میں
زندگانی کی جلائے ہوئے بانی مشعل
تو تیرا عزم جواں بن کے میرے ساتھ رہی (مہکتی ہوئی رات)

***

۳۔ آزاد نظم :۔ انگریزی ادب میں شاعری کی جو ہیئت فری ورس (Free Verse) کہلاتی ہے ہمارے شاعروں نے اسے اپنایا اور آزاد نظم نام رکھا۔ دراصل یہ فری ورس کی ایک شعری ہیئت ہے۔ یہ وزن اور قافیہ دونوں کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ لیکن ہمارے شاعروں نے اپنی شاعری کے مزاج کو دیکھتے ہوئے کچھ پابندی باقی رکھی ہے۔ ہم نے ~~وزن کے معاملے میں~~ مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی کرکے چھوٹے بڑے مصرعے جوڑے جاتے ہیں۔ مثلاً :۔

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے۔

***

۴۔ نثری نظم :۔ نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں ردیف، قافیے اور وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔ آج کل نثری نظموں کا رواج دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔

***

۵۔ مثلث :۔ تین تین مصرعے جن میں دو ہم قافیہ اور تیسرا ہم قافیہ نہیں ہوتا مثلاً :۔

نہیں ہوں اتنا بھی نادان بھلا میں اے ناصح
سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں حال جان کے آ ہنگی

***

۶۔ مثمن :۔ اس نظم کو کہتے ہیں جو آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہو جن میں چھ مصرعے

October 2014

M	T	W	T	F	S	S
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30	31		

November 2014

M	T	W	T	F	S	S
					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30

ہم قافیہ ہوتے ہیں اور آخری دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً

اے چارہ گر آ چُک کہ دمِ چارہ گری ہے
میں جان سے جاتا ہوں تجھے بے خبری ہے
کیوں پہلے ہی ارمان سے یقین بے اثری ہے

اپنی سی تو کر دیکھو عبث نسخہ دری ہے
ہو جاؤں میں جانبر تو تری نام وری ہے
یو دعوئ حرف ہو تو بے سود سری ہے

گر ہم سے مریضوں کی دوا ہو وے تو جانیں
بیمارِ محبت کو شفا ہو وے تو جانیں

***

۷۔ مربع:۔ چار چار مصرعوں کا بند جن کے تین مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مربع اور رباعی میں فرق یہ ہے کہ رباعی کا عموماً تیسرا اور مربع کا چوتھا مصرعہ مختلف قافیہ کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مربع کا کوئی خاص وزن مقرر نہیں۔ جبکہ رباعی کے اوزان مقرر ہے۔ مثلاً:۔

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

***

۸۔ مخمس:۔ پانچ پانچ مصرعوں کا بند جن میں چار ہم قافیہ اور پانچواں خلافِ قافیہ ہوتا ہے۔ کبھی بند کا پانچواں حصہ مکرر آتا ہے۔

NOTES

حالت تو یہ ہے کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میر بے دماغ
از بس کہ کم نے پایا ہے اشتہار

Scanned with CamScanner

۹۔ مستزاد:۔ مستزاد وہ شکل ہے۔ جس میں ہر مصرعے کے بعد ایک چھوٹا سا ٹکڑا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ مستزادِ عارضی ۲۔ مستزادِ لازم

اول وہ ہے کہ فقرہ زیادہ کیا جائے وہ مضمون شعر سے متعلق نہ ہو۔ دوسرا وہ کہ جو فقرہ زیادہ کیا جائے وہ مضمون شعر کے آخر میں اضافہ کیا جائے اور وہ مضمون شعر کے لئے ضروری ہو۔

مستزاد کی کئی صورتیں ہیں کبھی ایک فقرہ اور کبھی دو فقرے اور زیادہ فقرے مصرعے کے آخر میں اضافہ کیئے جاتے ہیں۔ ع

میں ہوں عاشق مجھے غم کھانے سے انکار نہیں کہ یہ غم میری غذا
تو ہے معشوق تجھے غم سے سروکار نہیں ممکن ہے غم میرا بھلا

۱۰۔ مسدس:۔ چھ چھ مصرعوں کا بند ہیں جس میں چار ہم قافیہ اور دو خلافِ قافیہ ہوتے ہیں۔ یا ہر بند میں مصرعے مکرر آتے ہیں۔

سب یا علامت گران کو بتائیں — تو تشخیص میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں — یونہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہے اگر نہ مانوس ہوں وہ — یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ

مسدس کہنے والے شعرا میں مولانا حالی کا رتبہ سب سے بلند ہے۔ ان کی مثنوی "مدو جزرِ اسلام" بحیثیت مسدس کے ہر اعتبار سے مکمل اور لاجواب ہے۔

۱۱۔ مسمط:۔ ایسی نظم جو بندوں پر مشتمل ہو خواہ بصورت مخمس، مربع، مسدس، مثمن وغیرہ۔ بندوں کے آخری مصرعے پہلے بند کے مصرعہ آخر کے تابع ہو۔

Sunday 23

ہو تارخ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو شنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہوتی، کچھ نازو ادا کے ڈھنگ بھرے

NOTES

دل پھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ بلبلیں کھٹ کیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں موسم کی

Scanned with CamScanner

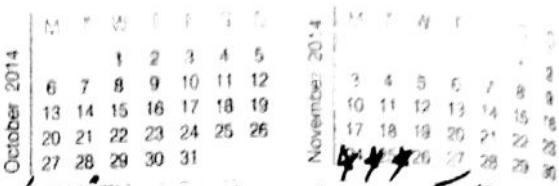

۱۲- ترکیب بند:- اس میں غزل کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ نظم کا ہر بند غزل کی شکل میں ہوتا ہے۔ لیکن ہر بند کا آخری شعر دوسرے قافیے میں ہوتا ہے۔

۱۳- ترجیع بند:- یہ ترکیب بند کی طرح ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ترکیب بند میں ٹیپ کا شعر ہر بند میں الگ ہوتا ہے جبکہ ترجیع بند ٹیپا کا ایک ہی شعر ہر بند کے آخر میں دُہرایا جاتا ہے۔

۱۴- قطعہ:- قطعے میں غزل کی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ لیکن غزل کے برخلاف اس کے معنی میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

۱۵- ریختی:- ایسے اشعار جن میں عورتوں کی زبان اور محاورات بولے جاتے ہیں۔ ریختی کے موجد سعادت خان یار رنگین سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے دوست انشار اور متاخرین میں خان صاحب نے اس فن کو بڑی ترقی دی ہے۔

نہ دیکھ دولہا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اُٹھا اُٹھا کر
نئی نویلی دلہن ہے ابھی، ابھی چار دن حیا کر

۱۶- شہر آشوب:- ایسی نظم جس میں زمانے کے آشوب، ہنگامے اور بری حالت بیان کی گئی ہو، معاملات کے درہم برہم ہو جانے، شرفاء کی بے عزتی اور رذیلوں کی گرم بازاری وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ میر، شاکر خان ناجی، سودا، اور داغ نے کامیاب شہر آشوب لکھے ہیں۔

۱۷- مناجات:- ایسی نظم میں بارگاہ الٰہی میں دعا مانگی جاتی ہے۔ جیسے

یاالٰہی گرمیٔ محشر سے جب بھڑکیں بدن
دامنِ محبوبؐ کی ٹھنڈی ہوا کا ساتھ ہو
یاالٰہی جب سرِ شمشیر پر چلنا پڑے
ربِ سلّم کہنے والے غمزدہ کا ساتھ ہو۔

NOTES

۱۸- حمد:- جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، تعریف کی جائے۔

۱۹- نعت:- سرورِ کائنات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہی جانے والی نظم کو نعت کہتے ہیں۔ اردو میں ظفر علی خان، امیر مینائی، حسرت موہانی، حالی، اقبال، ~~[illegible]~~ امام احمد رضا خانؒ، مولانا جامیؒ کے علاوہ بہت سے شعرا نے نعتیں لکھی ہیں۔

۲۰۔ منقبت: کسی مذہبی شخصیت کے اوصاف اور تعریفوں میں کہی جانے والی نظم کو منقبت کہتے ہیں۔

ہے کرنیں اک ہی مشعل کی
بوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

Notes prepared By Sheraz Ahmad Dar.
M.A. B.Ed.
7889726757

چہروں کی لکیروں سے کتنا پڑھو گے غمگین
لوگ دل کے اندر اپنی اک کتاب رکھتے ہیں
(غمگین ڈار)

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

"مثنوی"

لغت کے اعتبار سے مثنوی کے معنی ہیں "دو دو" یا "دو جُزو والی چیز" یا اس کے معنی ہیں "دوہرا کرنا"۔ گرامر کے لحاظ سے مثنوی "مثنا" سے مشتق ہے جس کے معنی بھی "دو دو" کے ہیں۔ اصطلاح شعر میں مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں مگر ہر شعر کا قافیہ مختلف ہو، بحر ایک ہوتی ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ مثنوی اردو ادب کی قدیم صنف شاعری ہے۔ اس میں ہر قسم کے خیالات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے۔ قدیم شعرائے ادب نے اس صنف کی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ طویل مثنویوں میں میر حسن کی "سحر البیان" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزارِ نسیم" بہت مشہور ہیں۔

مثنوی کے لئے لازمی ہے کہ سب سے پہلے حمد لکھی جائے اور اس کے بعد اصلی مقصد بیان کیا جائے۔ غزل اور قصیدے کی طرح اس میں قافیے کی پابندی نہیں۔ اس میں مضمون مسلسل ہوتا ہے۔ مثنوی میں رزم و بزم، حسن و عشق، پند و نصیحت، مدح و ہجو، تصوف و فلسفہ، بادشاہوں اور امیروں کی تعریف، باغ، جنگل، بیابان، میدان، پہاڑ، کوئی تاریخی، اخلاقی مذہبی یا فرضی قصہ یا حکایت غرض ہر طرح کے مضامین آتے ہیں۔ مثنوی کا ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے ایسا ملنا چاہئے جیسے ایک ڈھلی ہوئی زنجیر کی کڑیاں آپس میں ملتی چلی جاتی ہے اور کہیں سے ناہمواری ظاہر نہیں ہونے پاتی۔

غزل اور دیگر اصناف کے مقابلے میں مثنوی میں ایک الگ الگ طریقۂ اظہار کی بہت گنجائش ہے۔ اس میں ڈرامائی انداز، مرقع نگاری کی شاعری، طربیہ شاعری کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کی معنی آفرینی، رزمیہ اور قصیدہ کا طمطراق (شان و شوکت) غزل کی دلگدازی غرض سب کچھ سما سکتا ہے۔ غزل کا آرٹ غنائی (نغمہ کا) اور مثنوی کا آرٹ توضیحی (کھول کے بیان کرنا) ہے۔

مثنوی کی خصوصیات:-

واقعات کا تسلسل اور ان کی ترتیب مثنوی کی اہم خصوصیات ہیں۔ یہ خصوصیت موجود ہوں تو مثنوی کامیاب بن جاتی ہے۔

واقعات نگاری اور اسلوب بیان:- واقعات کی بنیاد خواہ اصلیت پر ہو یا خیال پر وہ اس طرح بیان کئے جائے ان کی ایک ہو بہو تصویر سامنے آجائے۔ مثنوی میں اُس دور کے رسم و رواج، بول چال اور طرزِ معاشرت کی عکاسی کی جاتی ہے جس دور میں یہ لکھی گئی ہو۔ اور جس ڈھنگ سے یہ عکاسی کی جائے اسے واقعہ نگاری کہتے ہیں۔ واقعہ خواہ کتنا ہی دلچسپ، مربوط اور پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اگر سلیقہ کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو بیکار ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی مقبولیت کا دارومدار زبان اور خوبصورت

پیرایۂ اظہار پر ہے۔ اردو کی بہترین مثنویاں وہی ہیں جن میں اسلوبِ بیان کی خوبیاں ملتی ہیں۔

کردار نگاری:۔ مثنوی میں سینکڑوں اشخاص کا ذکر آ سکتا ہے۔ ان مختلف اشخاص کا اخلاق، طرز زندگی، مزاج، گفتگو، رہن سہن وغیرہ مختلف ہوتا ہے۔ مثنوی کے تمام کرداروں کی امتیازی خصوصیات کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

"مرثیہ"

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے جو لفظ "رثا" سے مشتق ہے جس کے معنی رونے، ماتم کرنے اور آہ وزاری کرنے کے ہیں۔ یہ صنف عربی شاعری میں رائج تھی اور اپنے عزیز اور بزرگ ہستیوں کے انتقال پر رنج والم کے جذبات سے لبریز جو اشعار کہے جاتے تھے انہیں مرثیہ کہا جاتا تھا۔ لیکن اردو میں مرثیہ صرف اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے۔ دوسرے لوگوں کی موت پر کہی جانے والی نظموں کو شخصی مرثیے کا نام دیا جاتا ہے۔

مرثیے سے مراد ایسی نظم ہے، جس میں مرنے والے کے اوصاف بیان کر کے اس کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا جائے۔ مرثیہ کی کوئی شکل متعین نہیں۔ مرثیے تین مصرعوں، چار مصرعوں اور چھ مصرعوں کے بندوں کی شکل میں بھی نظم کئے گئے ہیں۔ اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں ہے۔ ابتدائی زمانے کے مرثیے، غزل، مثنوی اور ترکیب بند وغیرہ کی ہیئتوں میں بھی موجود ہیں۔ سودا نے مسدس، منفردہ اور مستزاد کی ہیئتوں میں بھی مرثیے لکھے ہیں۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ مرثیہ کے لئے مسدس کی جو ہیئت مخصوص ہوئی ہے اس کی ابتدا سودا سے ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں مرثیہ مسدس کی ہیئت کا پوری طرح پابند نہیں رہا۔ غالب نے مرثیۂ عارف اور حالی نے مرثیۂ غالب ترکیب بند کی ہیئتوں میں لکھ کر مسدس کی ہیئت سے گریز کا آغاز کیا۔

محمد علی جوہر، سیماب اکبرآبادی اور حفیظ جالندھری وغیرہ نے مرثیوں کے لئے غزل، قطعہ، رباعی اور مخمس کی ہیئتیں اختیار کیں ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ مرثیہ ہیئت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے محدود و مخصوص موضوع کی بنا پر صنفی شناخت رکھتا ہے۔ تاہم شہدائے کربلا کے ماتم پر جو مرثیے لکھے جاتے ہیں ان میں چند اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً:-

۱۔ چہرہ:- چہرہ مرثیہ کی تمہید کو کہتے ہیں۔

۲۔ سراپا:- اس حصے میں مرثیہ کے ہیرو کے اوصاف بیان کئے جاتے ہیں۔

۳۔ رخصت:- اس حصے میں ہیرو کو میدان جنگ میں جانے کے لئے حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام اور عزیز و اقارب سے رخصت لیتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

۴۔ آمد:- اس حصے میں میدان جنگ کی منظر کشی، گھوڑے اور ہتھیاروں کی مبالغہ آمیز تعریفیں کی جاتی ہیں۔

۵۔ رجز:- ہیرو کے خاندان کی بہادری اور مہارت بیان کی جاتی ہے۔

۶۔ جنگ:- اس حصے میں اصلی جنگ کی منظر کشی بیان کی جاتی ہے۔

۷۔ شہادت:- اس حصے میں ہیرو کے شہید ہونے کا بیان کیا جاتا ہے۔

۸۔ بین:- اس آخری حصے میں شہید کی خوبیاں موثر انداز میں بیان کی جاتی ہے۔ ماتم اور آہ وزاری کا بیان ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

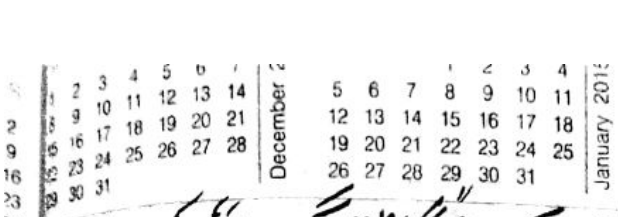

قصیدہ

قصیدہ دراصل عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنیٰ "گاڑھے گودے" کے ہیں۔ لغت میں قصیدہ سے مراد ہے گاڑھا یا غلیظ مغز۔ بعضوں کے نزدیک اس کا مادہ قصد ہے جس کے معنی کوشش یا مقصد کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں قصیدہ اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی زندہ انسان کی تعریف کی جائے یا ہجو بیان ہو۔ کچھ علما کے نزدیک اس صنف کو "قصیدہ" نام اسلئے پڑا کہ شاعر ارادہ کرکے ایک خاص موضوع پر پوری توجہ کے ساتھ فکرِ شعر کرتا ہے۔ اس صنف میں نہ صرف کسی خاص موضوع پر بحث کی جاتی ہے بلکہ قصیدہ گو شعراء مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ مثلاً اس صنف میں مدح، ذم، ہجو، نصیحت، موعظت، مختلف کیفیات و حالات، تعریفِ بہار، شکایتِ روزگار وغیرہ جیسے مضامین بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ جس سے شاعر کا زورِ طبیعت معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کے دل میں فی الحقیقت کسی کے اچھے کاموں کی تاثیر ہوتی ہے اور وہ اس کے [illegible] اوصاف اور کارناموں کو بیان کرنے لگتا ہے۔ عرب کا کوئی شاعر اس وقت تک قصیدہ نہ کہتا تھا جب تک وہ ممدوح کو دراصل مدح کے قابل نہ پاتا [illegible] جو کچھ کہتا ہے کہتا تھا۔ صلہ اور انعام کے لئے قصیدہ لکھنا عرب کے شاعروں کے لئے باعثِ ننگ تھا۔ ایرانی شعراء نے اس جذبے کو مٹا کر قابل اور ناقابل تعریف میں قصیدے لکھے اور انعام و اکرام کا جذبہ ملحوظ رکھا۔ اس روش کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ قصیدے کا حقیقی مقصد فوت ہو گیا۔ قصیدہ نگاری دولت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔

قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسے مطلع کہتے ہیں۔ باقی اشعار کے صرف دو مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی قصیدے میں زیادہ مطلعے بھی ہوتے ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ قصیدے کی پہچان بھی اس کے موضوع اور ہیئت سے کی جاتی ہے اگر ان دونوں خصوصیات میں سے ایک کا بھی فقدان ہو تو یہ صنف اپنی پہچان کھو بیٹھتی ہے۔ قصیدے کی پہچان اسلئے مسلمہ ہے کہ غزل جیسی مقبول و معروف صنفِ سخن اسی کے بطن سے پیدا ہوئی اسلئے قصیدے کی ہیئت بڑی حد تک غزل سے ملتی ہے۔

NOTES

ترکیب و ساخت کی رو سے قصیدہ کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

۱۔ تمہیدیہ قصیدہ۔ ۲۔ خطابیہ قصیدہ۔

۱۔ تمہیدیہ قصیدہ اس قصیدے کو کہتے ہیں جس میں شعراء مدح یا ذم کے ذکر سے پہلے مناسب تمہید باندھتے ہیں۔ اس میں تمہید کے طور پر اصل موضوع سے پہلے کچھ اشعار شامل ہوتے ہیں۔

۲- خطابیہ قصیدہ اس قصیدے کو کہتے ہیں جس میں شاعر مدح و ذم کے ذکر سے پہلے تمہیدیہ اشعار نہ لکھے بلکہ مطلع ہی میں ممدوح سے ہی خطاب شروع کرتا ہے۔

جن قصیدوں میں کسی شہر کی تباہی اور بدحالی یا زمانے کی عام ابتری اور بدنظمی کا ذکر ہو ان کو اصطلاح میں "شہر آشوب" کہتے ہیں۔ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ شہر یا ملک کی خرابی کا حال "شہر آشوب" میں مختلف پیشوں کے حوالے سے کیا جائے۔ مثلاً سپاہی ہیں تو یوں تباہ حال ہیں طبیب ہیں تو ان کی زندگی یوں عذاب ہیں مدرس ہیں تو ان پر یہ مصیبت ہے وغیرہ۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی:-

۱۔ تمہید:- تمہید کے لغوی معنی "فرش بچھانے" کے ہیں۔ اس سے مراد کسی چیز کی ابتدا اور تعارف۔ تمہید میں شاعر معشوق کے اوصاف و خصائل، مناظر فطرت اور معاملات حسن و عشق کے مضامین ادا کرتا ہے۔ اس کو تشبیب بھی کہتے ہیں۔ اس میں مضامین کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ گریز:- اس سے مراد ہے متکلم کا ایک مطلب سے دوسرے مطلب کی جانب انتقال کرنا۔ اصطلاح میں اس شعر کو کہتے ہیں جہاں سے شاعر تمہید ختم کرکے مدح یا اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے۔

۳۔ مدح یا مذمت:- یہ قصیدے کا وہ خاص حصہ ہے جس پر قصیدے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس حصے میں شاعر عام طور پر مبالغہ آرائی سے کام لے کر ممدوح کے ان اوصاف کا ذکر کرتا ہے جو ممدوح کو دیگر اشخاص سے ممتاز کرتی ہیں۔

۴۔ مدعا:- ان اشعار سے شاعر کا بنیادی مقصد اظہار ہوتا ہے اس میں شاعر اشاروں سے کام لے کر ممدوح سے انعام و معاوضہ چاہتا ہے۔

۵۔ دعا / مقطع / خاتمہ:- یہ قصیدے کا آخری حصہ ہے۔ اس حصے میں شاعر ممدوح کے لئے خدا کے حضور سلامتی اور درازئ عمر کی دعا کرتا ہے۔

Scanned with CamScanner

قطعہ

قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں لیکن شاعری کی اصطلاح میں بغیر مطلع کے مسلسل غزل یا قصیدہ کو قطعہ کہتے ہیں۔ ابتدا میں اس کو قصیدہ کا حصہ تصور کیا جاتا تھا اس لئے اس کو قطعہ کہتے ہیں۔ لیکن اب یہ ایک مستقل صنف بن گئی۔ آج کل خاص طور پر اس صنف کو عروج حاصل ہوا ہے۔ قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا صرف قافیہ اور ردیف کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مضمون کے لحاظ سے قطعہ کے اشعار مسلسل اور مربوط ہوتے ہیں۔ قطعہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کا مطلب دوسرے شعر پر موقوف ہو۔ قطعہ میں کم سے کم دو شعر اور زیادہ سے زیادہ سترہ اشعار ہوتے ہیں۔ کئی اشخاص کے نزدیک سترہ کی قید لازمی نہیں۔ قطعہ کبھی کبھی غزل میں بھی آتا ہے۔ قطعہ اور غزل مسلسل میں فرق یہ ہے کہ غزل مسلسل کا ہر شعر تسلسل کے باوجود اپنی جگہ معنوی لحاظ سے قدرے مکمل ہوتا ہے۔ لیکن قطعے کے اشعار کا ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص ربط اور واسطہ ہوتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے اکیلا شعر نامکمل ہوتا ہے۔ عام طور سے قطعات میں اخلاقی اور نصیحت آمیز باتیں لکھی جاتی ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں قطعے کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ شبلی نعمانی، حالی، اقبال، اکبر، اختر شیرانی، اختر انصاری اور سلیم پانی پتی جیسے شعراء نے قطعہ کو بحیثیت ایک علیحدہ صنف سخن کے اعتبار سے وسعت دی۔ اور یہ صنف مقبول ہونے لگی۔ میر، سودا اور نظیر اکبر آبادی نے بھی اس صنف کی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ اگر شاعرانہ کمال کے ساتھ اس میں کوئی بلند اور گہرا خیال پیش کیا جائے تو بقول اختر انصاری "یہ ایک سمٹی ہوئی مختصر نظم ہے۔"

NOTES

Notes Prepared By Gumgeen Sheraz Dar.
M.A. B.Ed.

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

رُباعی

رباعی فارسی لفظ "رُبع" سے مشتق ہے جس کے معنی "چار" کے ہیں۔ اصطلاحِ شعر میں رباعی اس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جو مصرعوں پر مشتمل ایسا نظم ہو۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرا مصرعہ بھی اسی قافیے میں ہو تو کوئی حرج نہیں۔ چوتھا مصرعہ بہت زوردار ہوتا ہے۔ چوتھے مصرعے کو حاصلِ رباعی کہہ سکتے ہیں۔ وہ رباعی جس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں اُسے "رباعی ترانہ" کہتے ہیں۔ رباعی کے لئے اوزان مقرر ہیں۔ رباعی کی اصل پہچان ہی یہی ہے کہ وہ قافیوں، بحور اور اوزان پر مقرر ہوں۔ رباعی کے اوزان میں دوسری نظمیں بھی لکھی جا سکتی ہیں رباعی میں عام طور پر حکیمانہ، عاشقانہ، فلسفیانہ، اخلاقی اور مذہبی مضامین ادا کئے جاتے ہیں۔ بعض شاعروں نے خود کو مضامین کا پابند نہیں رکھا۔ غرض رباعی میں اور طرح کے مضامین بھی نظم کئے گئے۔ رباعی کے دوسرے نام دوبیتی، چہار بیتی اور ترانہ ہیں۔ رباعی کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں جو مضمون ہو وہ اچھوتا ہو، خیال بلند ہو، اور اندازِ بیان میں دلکشی ہو۔
اُردو میں بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں کہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اصل میں رباعی سب سے پہلے ایرانی شاعر "رودکی" نے کہی تھی اور اس کے اوزان وغیرہ مقرر کئے تھے۔ اُردو میں رباعی فارسی سے آئی ہے۔

ابتدا اور ارتقاء:-

سب سے پہلے رباعی کی ایجاد ایران میں ہوئی۔ اور پہلی رباعی بھی ایرانی شاعر رودکی نے کہی ہے۔ اُردو میں رباعی فارسی سے منتقل ہو کر آئی ہے۔ اردو میں پہلی رباعی دکن کے قدیم شاعر عبدالقادر سے منسوب ہے۔ دکن کے شعراء حضرات نے مجموعی طور پر کم رباعیاں لکھیں۔ دلی کے شعراء نے بھی اس صنف کی خوب طبع آزمائی کی جن میں، درد، سودا، میر حسن، میر، مومن، غالب وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ انیس اور دبیر نے اہلِ بیت کی تعریف و توصیف میں رباعیاں لکھیں۔ اردو رباعی کے ارتقاء میں میر انیس کا نام سرفہرست ہیں۔ انہوں نے بلند پایہ رباعیاں لکھیں۔
ترقی پسند تحریک کے بعد حالی اور اکبر نے رباعی کی صنف کو وسعت دی اور اس کو مقصدی شاعری کا ذریعہ بنایا۔ علامہ اقبال نے بھی مخصوص انداز میں مخصوص پیغام کو عام کرنے کے لئے نظموں کے علاوہ رباعی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ موجودہ دور کے شعراء نے بھی اس صنف کو اپنا کر اس کا دامن وسیع بنایا۔ ان شعراء میں جوش ملیح آبادی، یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ آج بھی اس صنف کو عروج حاصل ہے۔ جموں کشمیر میں الیاس تنویر صاحب نے بھی اس صنف کو اپنایا۔

کیا Page 65–73
65–73

(غزل گو شعراء)

میر تقی میر (1722ء) - (1810ء)

Saturday

حالاتِ زندگی :-

محمد تقی نام، میر تخلص۔ 1722ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پردادا حجاز سے دکن آئے آخر اکبر آباد (آگرہ) میں مستقل قیام کیا۔ آپ کے والد کا نام محمد علی تھا جو علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ میر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور سید امان اللہ سے حاصل کی۔ گیارہ سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوا اور کم عمری میں ہی روزی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ آگرہ سے دہلی چلے آئے اور کچھ عرصہ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خان آرزو کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔ لیکن انہوں نے میر کو ذہنی تکلیف پہنچائی۔ دہلی کا قیام ان کی شاعری کی پختگی اور عروج کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا بجھنے جا رہا تھا دہلی کے حالات ابتر ہوگئے تھے۔ بہت سے شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے جا رہے تھے۔ میر بھی نواب آصف الدولہ کی دعوت پر 1782ء میں لکھنؤ چلے آئے۔ آخر 90 سال کی عمر میں 20 ستمبر بروز جمعہ 1810ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

میر تقی میر کو اردو کا بہترین غزل گو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کو خدائے سخن، سرتاج شعرائے اردو، شاعرِ بے دماغ، اردو غزل کا بادشاہ جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ میر کے بعد آنے والے ہر بڑے شاعر نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے،

بقولِ غالب ؎

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ   کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

بقول حسرت موہانی ؎

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرتؔ   میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

میر نے کثرت سے تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے اُن کے چھ دیوان اردو غزل کے ہیں۔ ایک تذکرہ نکات الشعراء کے نام ہے اور چند مثنویاں بھی لکھی ہے۔ خود نوشت "ذکرِ میر" بھی ان کی ایک اہم یادگار ہے۔ ان کے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا کلام درد سے بھرا ہوا ہے جس کسے پڑھنے سے قاری کے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔

19 Sunday

Notes Pepared By Gumgeen Sheraz Dar.M.A B.Ed. 7889726757

NOTES

Scanned with CamScanner

خواجہ حیدر علی آتش

حالاتِ زندگی :-

حیدر علی نام آتش تخلص۔ ۱۷۷۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا جس بنا پر تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت نے انھیں جلد ہی نواب محمد تقی خان ترقی کے دربار تک پہنچا دیا۔ نواب کے ساتھ وہ لکھنؤ آ گئے اور پھر وہیں کے ہو گئے۔ اُن کے مزاج میں ایک فقیرانہ انداز تھا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ تقریباً تمام زندگی تنگی ترشی کے ساتھ گزار دی اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ آخری عمر میں ان کی بینائی چلی گئی تھی جس کی وجہ سے ادھر اُدھر آنا جانا ترک کیا تھا اور اپنے چھوٹے سے ہی مکان میں بیٹھے رہتے تھے جہاں ہر وقت شاگردوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ آخر ۷۶ سال کی عمر میں لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

آتش کا درجہ اردو شاعری میں گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ ان کے مزاج میں جو قلندرانہ شان تھی وہ ان کی شاعری میں بھی نظر آتی تھی۔ وہ چھوٹی سی بات کو بھی بڑی دھوم دھام سے کہتے ہیں۔ اُن کے ہاں دنیا کے بارے میں ایک بلند ہمت اور قلندرانہ بے پرواہی ملتی ہے یہ چیز دل کو متاثر کرتی ہے۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا میں آتش کا مرتبہ ناسخ سے بلند ہے اور اُن کا انداز بیان اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ اُن کی پیش کش سادہ اور شگفتہ ہے۔ آتش نے صرف صنفِ غزل ہی میں طبع آزمائی کی۔ وہ صاحب طرز غزل گو تھے۔ اُن کے شاگردوں میں رند، صبا، خلیل، نسیم، مرزا شوق بہت مشہور ہوئے۔

Scanned with CamScanner

مرزا اسد اللہ خان غالب

حالاتِ زندگی :-

اسد اللہ خان نام غالب تخلص تھا۔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء تھا۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے ہندوستان آئے ان کے خاندان کو ملک میں مناسب مرتبہ ملا۔ غالب پانچ سال کے تھے جب والد کا انتقال ہو گیا اس کے بعد ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی۔ چار سال بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور گھر میں مرزا کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ تیرہ سال کی عمر میں غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے دلی میں ہوئی۔ 1857ء میں مرزا کو بڑی صعوبتیں جھیلنی پڑی۔ غالب کے آخری دن لمبی بیماری کی وجہ سے تکلیف میں گزرے لیکن ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ غالب کا انتقال 1869ء میں دہلی میں ہوا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

غالب کو اردو کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فارسی شاعری میں بھی ان کا مرتبہ بلند ہے۔ زندگی کے ایک بڑے حصے میں انہوں نے اردو میں بہت کم کہا۔ یوں تو غالب اپنے فارسی کلام کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے مگر زمانے نے قبولیتِ عام کا تاج ان کی اردو شاعری کے سر پر رکھا۔ ان کا اردو غزلوں کا دیوان جس میں کل اٹھارہ سو اشعار ہے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ غالب بات کو ایک اچھوتے انداز میں بیان کرتے ہیں اور معمولی مضمون کو بھی شعر میں انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہ ہوگا جس پر ہم غالب کے کسی نہ کسی شعر کے ذریعے اظہار رائے نہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں جتنے شعر ضرب المثل ہو گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ اشعار غالب کے ہیں۔

بلاشبہ غالب ایک ایسے عظیم اور بلند پایہ شاعر ہیں جو اردو ادب کی دنیا پر آج بھی غالب ہیں۔ انہوں نے اردو نثر و نظم میں ایک الگ راہ نکالی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلیں بھی ان سے فیض حاصل کرتی رہیں گی۔

NOTES

Notes prepared By غمگین شبیر ڈار

Gumgeen Dar
Nowgam Ehrari Sharief

Scanned with CamScanner

شادؔ عظیم آبادی

حالاتِ زندگی :-

آپ کا اصلی نام سید علی محمد تھا۔ شادؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم گھر پر ہی ہوئی جس کا سلسلہ چار سال کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک انگریزی بھی پڑھی۔ اپنی ذاتی لیاقت اور لائق اساتذہ کی تربیت سے اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے ساتھ ساتھ مذہبی علوم اور فنِ شعر میں ایسی مہارت حاصل کی کہ ان کا شمار دورِ جدید کے اہلِ علم شعرا میں ہوتا ہے۔ اسلامی علوم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے عیسائیوں، آتش پرستوں (پارسیوں) اور ہندوؤں کی مذہبی کتابیں بھی پڑھی تھی۔ اُن کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے ۱۸۹۱ء میں خان بہادر کا خطاب دیا۔ آخر کار ۱۹۲۷ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

شاعرانہ خصوصیات :-

نثر و نظم دونوں میں شاد نے کئی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ شاد کی غزلوں کا دیوان اُن کی وفات کے بعد "نغمۂ الہام" کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ان کی خود نوشت "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ حیاتِ فریاد، رباعیاتِ شاد، سروشِ ہستی، میخانۂ الہام، مادرِ وطن اور متعدد مجموعے منظرِ عام پر آئے۔

شاد نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی شہرت کا باعث ان کی غزلیں ہیں۔ شاد کے زمانے میں غزل کا زور اور اثر کم ہونے لگا تھا، شاد نے اُسے نکھارنے اور سنوارنے میں اہم کردار نبھایا۔ وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ، اخلاق، فلسفہ اور توحید ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ ان سب کو اپنے لطیف اندازِ بیان سے دل پذیر اور پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

فانی بدایونی

حالاتِ زندگی:-

شوکت علی خان نام، پہلے شوکت اور بعد میں فانی تخلص اختیار کیا۔ 13 ستمبر 1879ء کو اسلام نگر بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد محمد شجاعت علی خان انسپکٹر پولیس تھے۔ فانی نے دستور زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ بریلی کالج سے بی،اے پاس کرنے کے بعد ملازمت اختیار کی۔ کچھ عرصے تک مدرس رہے بعد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے۔ لیکن جلد ہی ملازمت ترک کر کے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایم، اے، او کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) علی گڑھ میں داخل ہو گئے۔ فانی کو وکالت سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے اس پیشے میں انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی فانی کے آخری ایام بڑی عسرت، تنگ دستی اور پریشانی میں گزرے۔ اُن کی صحت روز بہ روز گرتی گئی۔ بالآخر 27 اگست 1941ء کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

فانی کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ پہلی غزل گیارہ سال کی عمر میں کہی۔ والد شاعری کے خلاف تھے۔ اس لئے فانی چھپ کر شعر کہتے تھے۔ وہ کسی استاد سے اپنا کلام اصلاح کے لئے نہ دے سکے۔ زیادہ تر کلام ضائع ہو گیا۔ جو کچھ بچا وہ باقیاتِ فانی کے نام سے شائع ہوا۔ بعد میں ایک اور مجموعہ "عرفانیاتِ فانی" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔

فانی کا شمار اُردو کے ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں اعلیٰ درجے کی فن کاری پائی جاتی ہے۔ فانی نے حسن و عشق کو بھی موضوع بنایا اور تصوف اور معرفت کے مضامین بھی نظم کیے۔ لیکن ان کا اصل موضوع غمِ حیات ہے۔ موت ان کے ہاں ایک محبوب کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اُسے اپنی زندگی کے سارے دکھوں کا علاج سمجھتے ہیں۔ اس خصوصیت کی بنا پر اکثر فانی کو یاسیات کا امام کہا جاتا ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

عرش صہبائی

حالاتِ زندگی:-

آپ کا اصلی نام ہنس راج البرول اور تخلص عرش صہبائی ہے۔ آپ کی ولادت 5 ستمبر 1930ء کو اکھنور تحصیل کے ایک چھوٹے گاؤں سیری پلائی میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج میں داخلہ لیا لیکن اُسے جاری نہ رکھ سکے۔ ریڈیو کشمیر جموں میں ملازمت اختیار کر کے وہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

عرش نے اپنی شعری زندگی کا آغاز سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں کیا۔ اُردو کے مشہور شاعر جوش ملسیانی کے شاگرد تھے۔ 1963ء تک انہیں سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ آپ نے اگرچہ اُردو کی اکثر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن آپ کی شاعری کا زیادہ تر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس وقت تک آپ کے تین شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جو دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں اُن کے نام "شکستِ جام"، "شگفتِ گل"، "صلیب" ہیں۔ شگفتِ گل پر آپ کو ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے انعام بھی ملا۔ نثری تصانیف میں "انجم کدہ" "یہ جانے پہچانے لوگ" اور مختلف اُردو شعرا کے تذکرے شامل ہیں۔

عرش نے شاعری تو روایتی انداز سے شروع کی تھی لیکن آگے چل کے بعض موقعوں پر عصری مسائل کا بھی احاطہ کیا۔ ان کی زبان صاف اور رواں ہے۔ اکثر چھوٹی بحروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ سادگی ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔

Scanned with CamScanner

اکبر جے پوری ۴

حالاتِ زندگی:-

آپ کا نام سید محمد اکبر اور تخلص اکبر ہے۔ ادبی حلقوں میں اکبر جے پوری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت 23 اکتوبر 1925ء کو جے پور راجستھان میں ہوئی۔ والد کا نام آغا سید علی عابدی تھا۔ اکبر جے پوری پیشے سے معلم تھے۔ آپ کا ادبی سفر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں آپ کے وارد کشمیر ہونے سے پہلے ہی شروع ہوا تھا۔ آپ 4 مارچ 1998ء کو سرینگر کے حسن آباد رعناواری علاقے میں واصلِ بحق ہوگئے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

غزلوں کے علاوہ اکبر جے پوری نے حمد، نعت، مدح اور رثائی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ رومانی شاعر تھے۔ شمعِ فروزاں، شبابِ وطن، سازِ شکستہ، فکر و خیال اور فکر و فن آپ کے شائع شدہ شعری مجموعے ہیں۔ چمن زار اور بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ "شگوفے" انکی وفات کے بعد شائع کئے گئے ہیں۔

— ۲ —

سجا کے اپنے خواب رکھتے ہیں ۲ ۲
لوگ چہروں پر دوہرے نقاب رکھتے ہیں

(غمگین ڈار)

Gumgeen Dar
Nowgam Ehrari Sharief

12 Sunday

Scanned with CamScanner

T	W	T	F	S	S
				1	2
4	5	6	7	8	9
11	12	13	14	15	16
18	19	20	21	22	23
25	26	27	28	29	30

November 2014

M	T	W	T	F	S	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	31				

December 2014

Friday 10 OCT 2014 283-082 • WK 41

ہمدم کاشمیری

حالاتِ زندگی / ادبی شاعرانہ خصوصیات:-

عبدالقیوم خان نام اور ہمدم تخلص۔ آپ کی ولادت 15 اپریل 1937ء کو شہید گنج سرینگر میں ایک متوسط (اوسط درجہ کا) گھرانے میں ہوئی۔ والد کا نام نور محمد خان تھا۔ آپ کے والد پیشے سے تاجر تھے۔

ہمدم کاشمیری اردو کے تجربہ کار شاعر ہیں۔ انہوں نے شعر گوئی کی ابتدا اکیس (21) سال کی عمر میں کی۔ "دھوپ لہو کی" آپ کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ آپ نے نعتیں بھی کہی ہیں لیکن غزل آپ کی محبوب ترین صنف ہے۔ آپ ایک معتبر غزل گو ہیں۔ غزل کی خوبی یہی ہے کہ اس میں شاعر اپنی ذاتی اور اپنی اجتماعی زندگی کے تمام تجربات کو سمیٹ کر تخلیقی تجربات کا اظہار کریں۔ یہ چیز ہمدم کاشمیری کے یہاں بہت ساری غزلوں میں نظر آتی ہے۔

Scanned with CamScanner

شبیب رضوی

حالاتِ زندگی:-

سید محمد شبیب رضوی 25 جون 1935ء کو زیر پور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر صرف پانچ سال کی تھی کہ ان کے والد سید مواعظ حسین رضوی کا انتقال ہوگیا۔ دینی تعلیم گھر پر اپنی والدہ سے حاصل کی۔ عربی و فارسی میں فاضل تفسیر، کامل اور صدر الافاضل کی اسناد حاصل کی۔

ہندی میں پروفیشنل اور اردو میں ادیب ماہر علی گڑھ کے امتحانات بھی پاس کیے۔ طبیہ کالج (لکھنؤ) سے الف، ایم، بی، ایس (طب) کی ڈگری حاصل کی۔ گورنمنٹ طبیہ کالج سرینگر میں بھی ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں میڈیکل آفیسر کے منصب سے سبکدوش ہوئے۔ وہ 1963ء سے کشمیر میں قیام پذیر ہیں 1968ء میں انکی شادی سرینگر کے ایک شریف گھرانے میں ہوئی

شاعرانہ خصوصیات:-

شبیب رضوی کو شعر کہنے کی ترغیب گھر کے ادبی ماحول خصوصاً بڑے بھائی سے ملی اس طرح گیارہ سال کی عمر میں شاعری کی ابتدا ہوئی۔ بعد میں مختلف اصناف سخن خصوصاً مرثیہ، سلام، نعت، منقبت وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ غزلیں، نظمیں اور قطعات و رباعیات خاصی تعداد میں لکھی۔ کشمیر کی خوبصورتی سے وہ بے حد متاثر رہے ہیں انہوں کشمیر کے پس منظر پر سو سے زیادہ پابند اور آزاد نظمیں لکھی ہیں۔

شبیب رضوی اردو کی شعری روایت کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ وہ اب تک پینتالیس ہزار (4,500) اشعار کہہ چکے ہیں۔ ان کے سلاموں کے چار مختصر مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں و غزلوں کی بیاض "آتشِ چنار" نعت و منقبت پر مشتمل "حرفِ فروزاں" شائع ہوئے۔ 2009ء میں "بچوں کے مشاعرے" کی اشاعت ہوئی۔ کچھ غزلیں اور نظمیں ابھی زیر ترتیب ہیں۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar.
M.A. B.Ed.

NOTES

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

Page 81-94

81

274-091 • WK 40 OCT 2014

01 Wednesday

تشریح غزلیات

میر تقی میر

غزل 1

۱۔ ہمارے آگے جب تیرا کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جب کوئی بھی غیر میرے سامنے تیرا نام لیتا ہے تو میں اپنے پر ستم اور افسردہ دل کو دلاسا دیتا ہوں۔ یعنی تیرا نام کسی غیر کی زبان پر لانا مجھے بہت رنجیدہ کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے میں اپنے بے چین دل کو سنبھالتا ہوں۔

۲۔ وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھو
نہ سیدھی طرح سے اس نے میرا سلام لیا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی بے رخی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا محبوب اس قدر بے وفا اور سنگ دل ہے کہ جب بھی وہ مجھے ملتا تو سیدھی طرح سے وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتا ہے۔ اور نہ ہی کبھی میری سلام کا کبھی جواب بھی اچھی طرح سے دیتا ہے۔ یعنی وہ مجھے ایک اجنبی سمجھ کر دور ہی چلا جاتا ہے۔

۳۔ میرے سلیقے سے نبھی میری محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں اپنی محبت کو سلیقہ اور شائستگی سے نبھانے کے باوجود بھی ہر وقت ناکام رہا۔ میں نے ہر وقت محبت میں محرومیوں سے سامنا کیا۔ مگر اس کا اظہار نہ کرتے ہوئے میں نے محبت کو رسوا ہونے سے بچا لیا۔

۴۔ اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمین تمام لیا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں صنعت تعلّی سے کام لے کر اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں بھلے ہی دنیا کے شاعروں سے الگ تھلگ اور بالکل گمنام ہوں مگر میر شاعری میں اتنا اثر ہے کہ تمام دنیا میں رہنے والے میرے شعروں کو گنگناتے رہتے ہیں۔

غزل 2

۱۔ ہنگامۂ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے دل کی بے صبری اور بے چینی اور غمزدہ ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا دل محبوب کی جدائی میں اس قدر بے چین اور بے سکون تھا کہ دل کی ہر فریاد میں قیامت جیسا شور پیدا ہو رہا تھا۔ شاعر نے اپنے دل کی بے صبری کو موثر انداز میں قیامت کے شور سے تشبیہ دی ہے۔

۲۔ پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جب تک انسان اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا ہے تب تک وہ خدا کو بھی پہچان نہیں سکتا۔ لہٰذا جب میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا میں نے خدا کو بھی پہچان لیا۔ ورنہ میرے لیے خدا کو پہچاننا بہت مشکل کام تھا۔

Scanned with CamScanner

۳۔ آتشِ بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیمؑ یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے کہ شاعر اس شعر میں حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے موسیٰؑ اگر آپ کے دل خدا کا جلوہ دیکھنے کا شوق عشق کی حد تک ہوتا تو پھر اس عشق کی ایک تجلی ہی ہزاروں کوہِ طوروں کو جلانے کے لیے کافی تھی۔ گویا ~~شاعر~~ محبوب کے دیدار کے خاطر پہلے اپنے دل میں عشق کی آگ کو تیز کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ کل پاؤں جو ایک کاسۂ سر پہ جو آ گیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

یہ شعر میر تقی میر کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ کل راستے میں چلتے چلتے میرا پاؤں کسی مردہ انسان کی کھوپڑی سے ٹکرا گیا۔ تو میرے پاؤں نے اس کھوپڑی کو اس قدر روند ڈالا کہ وہ کھوپڑی چکنا چور ہو گئی۔

۵۔ کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسی کا سرِ پُر غرور تھا

شاعر فرماتے ہیں کہ جب وہ کھوپڑی میرے پیروں سے چکنا چور ہو گئی تو اس کھوپڑی کی ہڈیوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے بے خبر انسان ذرا دیکھ کر چل۔ آج تم نے مجھے اپنے پیروں تلے روندھ کر چلے گئے لیکن یہ آپ شاید بھول گئے ہو کہ کل تیرے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ میں بھی کبھی ~~جیتے~~ کسی جیتے جاگتے انسان کے سر کی عزت تھی۔ شاعر کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی ناپائیدار زندگی پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ زندگی، عزت اور شہرت ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔

۶۔ تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

یہ شعر میر تقی میرؔ کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا محبوب اس قدر حسین و جمیل تھا کہ جیسے جنت کی حور کی مانند تھا۔ لیکن جب تک وہ ہمارے پاس تھا تب تک ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اس میں اس کی کوئی کمی نہیں تھی یہ تو صرف میرا اپنا ہی قصور ہے کہ میں اپنے حسین و جمیل محبوب کو پہچان نہیں سکا۔

―・―

Scanned with CamScanner

خواجہ حیدر علی آتش

غزل

۱۔ دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی بے رُخی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہے کہ میرا محبوب میرے بارے میں کئی غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ ان کے گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں میرے لئے شک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔

۲۔ زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اس زمین پر آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جس سے نئی نئی باتیں وجود میں آتی ہے۔ غرض اس دنیا کی ہر چیز بے ثباتی ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں آئے دن ہر چیز میں تبدیلیاں آتی رہتی ہے۔

۳۔ نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں دنیا کی ناپائیداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے بادشاہ گزرے جن کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔ جن میں سکندرِ اعظم (یونان کا بادشاہ) جس نے پوری دنیا کو فتح کرنے کا عزم کیا تھا۔ اسی طرح دارا (ایران کا عظیم شہنشاہ) جس کی سلطنت میں کئی بڑے بڑے ممالک شامل تھے جن میں بلوچستان، عرب، مصر وغیرہ شامل ہے۔ لیکن اس اس دنیا کی ناپائیداری ایسی ہے کہ آج ان بڑے بادشاہوں کی قبروں کے نشان تک کہیں نہیں ملتے۔ گویا یہ دنیا اور اس سے وابستہ تمام چیزیں فانی اور بے ثباتی ہیں۔

۴۔ دل و دیدہ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمہارے لئے ہیں مکاں کیسے کیسے

یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہے کہ اے میرے محبوب تو دنیا والوں کے آنکھوں اور دلوں میں بسا ہوا ہو۔ اس لئے تیرے لئے ہر دل میں جگہ ہے۔ تو سب کا محبوب ہے۔

۵۔ غم و غصہ، رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہے مہرباں کیسے کیسے

یہ شعر آتش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنی مایوسی کا اس قدر اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں غموں اور پریشانیوں میں اس طرح گھرا ہوا ہوں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سارے غم اور پریشانیاں مجھ پر ہی مہربان ہو گئی ہے۔ اور خوشی کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہے۔

NOTES

غالب

غزل ۱

۱۔ ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں صنعتِ تلمیح سے کام لے کر فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ جو مردوں کو زندہ کرتے تھے اور لوگوں کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔ لیکن آج کوئی ابنِ مریم بن کر میرے دکھ کی دوا کیوں کر کرسکتا ہے۔ اصل میں میں کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ مجھے ایک قسم کا وہم ہے اور وہم کا کسی کے پاس علاج نہیں۔

۲۔ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں کہتے ہیں عشق کے جنون میں نہ جانے کون سی باتیں کر رہا ہوں۔ خدا کرے کہ کوئی میری اس گفتگو کو نہ سمجھے ورنہ رازِ عشق فاش ہو جائے گا۔

۳۔ روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں مختصر الفاظوں میں ایک انسان کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اگر کوئی انسان آپ کے سامنے کوئی غلطی کرے تو سزا دینے کے بجائے اس کو معاف کرنا چاہئے اور اگر کوئی انسان کسی غلط راستے پر چل رہا ہو تو اس کو اُس غلط راستے سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

۵۔ کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ مرزا غالب اس شعر میں فرماتے ہیں اس دنیا میں ہر انسان اپنی اپنی مجبوریوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اگر کوئی انسان کسی کے پاس کسی حاجت کے لئے جاتا ہے وہ خود محتاج ہوتا ہے وہ بھلا اس کی حاجت پورا کیسے کرسکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں کسی کے حاجت نکالنے پر شکایت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ ہر شخص کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہے۔

۴۔ نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں نصیحت آموز الفاظ میں فرماتے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ اگر کوئی آپ کو برا کہے تو برائی کا بدلہ نیکی سے دینا چاہئے۔ کسی کی بری بات سن کر ان سنی کرنی چاہئے۔ اور اگر آپ کو کسی کی کوئی بری بات معلوم ہو جائے تو اس کو چھپانے کے بجائے راز ہی رکھنا چاہئے کیونکہ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جو کسی مسلمان کے عیب پر پردہ ڈالے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈالے گا۔

۶۔ کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

یہ شعر غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں صنعتِ تلمیح سے کام لے کر فرماتے ہیں کہ یونان کا ایک مشہور بادشاہ سکندرِ اعظم حضرت خضرؑ کی رہنمائی میں آبِ حیات

کے قریب پہنچ کر بھی خالی ہاتھ لوٹا۔ ظاہر سی بات ہے خضر سے بڑھ کر کوئی کیا رہنما کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اگر خضر سکندر کی رہنمائی نہ کر سکا تو کسی اور دوسرے سے کوئی کیا توقع کر سکتا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۷۔ یہ شعر غالب کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ شکوہ یا گلہ وہاں کیا جاتا ہے جہاں کوئی توقع ہوتی ہے۔ جب کسی کی توقع ہی نہ رہی تو شکوہ یا شکایت کرنا بے سود اور بے فائدہ ہے۔ گویا توقع کے بغیر کسی سے کوئی گلہ کرنا مناسب اور جائز نہیں ہے۔

غزل ع ۲

۱۔ کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

یہ شعر غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میری زندگی ہمیشہ نامرادی اور ناکامی میں گزر بسر ہوئی۔ میری کوئی مراد کبھی پوری نہیں ہوئی اور نہ ہی مراد کو پورا کرنے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔

۲۔ موت کا اک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

یہ شعر غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ موت کا وقت مقرر ہے وہ کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ وہ اپنے مقررہ وقت پر آنی ہی آنی ہے۔ اب موت کے خوف سے نیند کا نہ آنا بے معنی اور بے سود ہے۔

۳۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

یہ شعر غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ پہلے مجھے پھر اپنے دل کی حالت یعنی افسردگی اور اداسی کی حالت پر ہنسی آتی تھی۔ مگر اب افسردگی، مایوسی اور اداسی کا یہ عالم ہے کہ مجھے اپنے افسردہ ہونے پر ہنسی نہیں آتی ہے۔

۴۔ ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یہ شعر مرزا غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے خاموش رہنے میں ایک مصلحت ہے۔ ورنہ میں بھی بات کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ گویا شاعر کسی خاص وجہ یا بات کی بنیاد پر خاموش ہے جسے وہ ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتا ہے۔

۵۔ مر مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہ شعر غالب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں نے ہر وقت زندگی میں غم ہی غم دیکھے ہیں۔ اب ان زندگی کی تلخیوں سے آزاد ہونے کے لئے میں نے موت کی تمنا کی تھی۔ لیکن یہ مراد بھی میری پوری نہیں ہوتی۔ بلکہ موت کی خواہش میں اس قدر تڑپتا ہوں جو موت سے کم نہیں۔ یعنی میں مر مر کر زندگی گزار رہا ہوں اور حقیقی موت نہیں آتی ہے جو مجھے اس زندگی سے چھٹکارا دلائے۔

۶۔ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ شعر غالب کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے گناہوں پر نادم ہو کے یہ اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ اے غالب تو اس قدر گناہ گار ہے کہ تو خدا کی بارگاہ یعنی کعبۃ اللہ میں جانے کے قابل نہیں ہے۔ مگر پھر بھی تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جانے سے تھوڑی سی بھی شرم محسوس نہیں کرتے ہو۔

Scanned with CamScanner

شاد عظیم آبادی

(غزل)

۱۔ تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

یہ شعر شاد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک بچے کو کھلونے دے کے دل بہلایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ انسان کا دل خواہشات اور تمناؤں سے بہلایا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ساری خواہشات پوری تو نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اُن کو پورا کرنے پیر اڑے رہتا ہے۔ لیکن اور اس طرح وہ حقیقی زندگی سے بے خبر رہتا ہے۔

۲۔ ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ — اُدھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

یہ شعر شاد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی گلیوں سے واقف ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کی ہر گلی سے واقف ہوں۔ کیونکہ یہاں میرا آنا جانا صدیوں تک رہا ہے۔ گویا شاعر عشق کے نشیب و فراز (اُتار چڑھاؤ) سے بالکل واقف ہے۔

۳۔ دلِ مُضطر سے پوچھ اے رونق بزم — میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

یہ شعر شاد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے کہ اس دنیا میں کوئی بھی انسان خود نہیں آتا ہے اور نہ ہی میں خود اس دنیا میں آیا ہوں۔ بلکہ مجھے اس دنیا میں لایا گیا تاکہ میں اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھ سکوں۔ مگر میں اس دنیا سے اکتا گیا ہوں مجھے اس دنیا میں رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

۴۔ نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا — بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

یہ شعر شاد کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں شراب کے کسی معجزے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مجھے زبردستی اسی بری عادت میں ڈالا گیا ہے۔ ورنہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ شراب پینے میں بھی کسی قسم کی تاثیر ہوتی ہے۔ گویا شاعر کو دنیا کی عیش و عشرت، شوق و مستی کو اپنانے کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔

۵۔ کجا میں اور کجا اے شاد دنیا — کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

یہ شعر شاد کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے میں بہت اچھی طرح خوش تھا۔ لیکن اس ظالم دنیا میں آکر مجھے کسی بھی قسم کا کوئی آرام نہیں ملا۔ لہٰذا یہ دنیا میرے لئے بالکل کوئی موافقت نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی میں اس دنیا میں آکر خوش ہوں۔

—٭—

فانی بدایونی
(غزل)

۱۔ دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

یہ شعر فانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں زندگی کو بے وقعت قرار دے کر اس پر موت کو ترجیح دے کر فرماتے ہیں کہ میرا اس دنیا سے بھلا کیا رشتہ ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ اس دنیا کی کیا قیمت ہے۔ میرا اس دنیا سے کیا لینا دینا ہے۔ شاعر دنیا کی اس زندگی سے تنگ آ کر موت کو اپنانے کی آرزو کرتا ہے اور زندگی کو مفت میں بھی قبول کرنا نہیں چاہتا ہے۔

۲۔ آبادی بھی دیکھی ہے ویرانی بھی دیکھی ہے — جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

یہ شعر فانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر شعر میں فرماتے ہیں کہ یوں تو میں نے دنیا میں ویران اور آباد بستیاں بھی دیکھی ہیں۔ لیکن دل جیسی انمول اور انوکھی دولت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اگر یہ دل کی بستی ایک بار اجڑ گئی پھر اس کا دوبارہ بسنا یا بسانا ناممکن ہے۔

۳۔ جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں — آگے مرضی گاہک کی، ان داموں تو سستی ہے

یہ شعر فانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ عاشق اپنے محبوب کی ایک ہی نظر میں اپنی جان اس پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اب محبوب کی مرضی کہ وہ اس قیمتی چیز کی کیا قدر کرے گا۔

۴۔ جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا — جب بھی دُنیا بستی تھی، اب بھی دُنیا بستی تھی

یہ شعر فانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبوب کی جدائی میں رو رو کر میری آنکھوں کی حالت اب اتنی ابتر ہو گئی ہے کہ یہ دنیا بھی مجھے اب تیری جدائی میں جلی ہوئی نظر آتی ہے۔ کسی کو کیا فرق پڑتا یہ دنیا تب بھی بستی تھی تب بھی آباد تھی اب بھی یہ دنیا کا کارخانہ چلتا رہتا ہے۔ میرے بغیر ہر کوئی اپنی دنیا بسانے میں معروف ہے۔

۵۔ آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے — دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

یہ شعر فانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبوب کی جدائی میں رو رو کے میری آنکھیں خشک ہو گئی۔ میری آنکھوں سے اب آنسو بھی رخصت ہو گئے۔ مگر میرے دل پر غموں اور دکھوں کے بادل اس قدر گھبرے ہوئے ہیں کہ نہ ہی یہ چھٹنے کا نام لیتے ہیں اور نہ ہی برستے ہیں۔ گویا شاعر کے دل سے محبوب کی جدائی کا غم ترو تازہ ہے۔

۶۔ دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم — بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

یہ شعر فانی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ دل ایک ایسی نازک چیز ہے کہ جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر اس دل کو بسانا بہت مشکل ہے۔ دل کی نگری کو آباد کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس دل کی بستی کو بسانا دوسری بستیوں کی طرح آسان نہیں ہے۔

NOTES

۷۔ فانی! جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا — ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

یہ شعر فانی کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ پہلے میں محبوب کے غم میں رو رو کے آنکھوں سے آنسوؤں کے بدلے خونِ جگر بہاتا تھا۔ مگر اب مجھے افسوس ہے کہ میری آنکھیں آنسوؤں کے ایک بوند کے لئے ترستی ہے۔ گویا شاعر آہستہ آہستہ محبوب کی جدائی کا غم دل سے نکالتا ہے۔

Scanned with CamScanner

عرش صہبائی

غزل ۱

۱۔ کون سا وہ زخم دل تھا جو تر و تازہ نہ تھا ۔۔۔ زندگی میں اتنے غم تھے جن کا اندازہ نہ تھا

یہ شعر عرش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنا زندگی کے غموں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار تکالیف برداشت کئے ہیں جن کی وجہ سے میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ میرا کوئی بھی زخم مرہم پزیر نہیں ہوا۔ یعنی میرے دل میں سارے غم ابھی تک تازہ ہے۔

۲۔ ہم نکل سکتے بھی کیوں کر حصارِ ذات سے ۔۔۔ صرف دیواریں ہی دیواریں تھی دروازہ نہ تھا

یہ شعر عرش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اپنے آس پاس کے ماحول نے مجھے اپنی ہی ذات کے خول میں قید کر دیا ہے۔ میرے لئے اس قید کی دیواروں سے نکلنا بہت ہی دشوار تھا۔ گویا شاعر اپنے اردگرد کے ماحول کو ناپسندیدہ ہونے کے باوجود بھی مجبوراً اسی ماحول میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

۳۔ اس کی آنکھوں سے نمایاں تھی محبت کی چمک ۔۔۔ اس کے چہرے پر نئی تہذیب کا غازہ نہ تھا

یہ شعر عرش کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر شعر میں ایک دلکش انداز میں اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا محبوب اس قدر حسین و جمیل اور حسن اخلاق سے برا ہوا تھا کہ جس کی محبت اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتی تھی۔ وہ سچی محبت کرنے والا انسان تھا اور اس کے چہرے پر نئی تہذیب کا کوئی نام و نشان ہی تھا۔

۴۔ عرش ان کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور ۔۔۔ ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

یہ شعر عرش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے عرش میرے محبوب کی گہری جھیل جیسی آنکھوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو میرے محبوب کی آنکھوں کی طرف ایک بار دیکھتا تھا وہ اس کو اپنا دل دے بیٹھتا تھا۔ کیونکہ وہ ان آنکھوں کی گہرائی سے بے خبر تھے۔

غزل ۲

۱۔ ہر ایک رنگ میں کاٹیں گے ہم سزا ہی سہی ۔۔۔ یہ زندگی کسی مفلس کی بددعا ہی سہی

یہ شعر عرش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنی زندگی کو ایک مفلس کی بددعا قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئی ہے۔ میری زندگی ہمیشہ غموں اور پریشانیوں میں سے گزری ہے اس کے باوجود بھی میں جینے کے لئے آمادہ ہوں گا۔

۲۔ نہ اس کو بھول کہ میں نے تجھے کیا تخلیق ۔۔۔ یہ اور بات کہ تو وقت کا خدا ہی سہی

یہ شعر عرش کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ یہ ایک بات ہے کہ آج وقت کا خدا بن بیٹھا ہے۔ لیکن اس بات کو بھی آپ نظرانداز نہیں کر سکتے کیونکہ تجھے اگر اعلیٰ مقام اور شہرت ملی ہے یہ میری محبت ہی کی وجہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں وقت کے حکمرانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تم جو آج دولت اور اقتدار کے نشے میں چور چور ہو گئے ہو یہ مت بھولو کہ ہم ہی نے آپ کو اس قابل بنایا ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

265-100 • WK 39
SEP 2014

22 Monday

August 2014

M	T	W	T	F	S	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

September 2014

M	T	W	T	F	S	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30					

۱۲ یہی بہت ہے کہ مجھ پر تیری توجہ ہے   تیری نگاہ کا انداز دوسرا ہی سہی

یہ شعر عرشؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ میرے لئے یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ کم تو میری طرف بھی دھیان دیا ہوا ہے۔ یہ دوسری بات ہے
10 تیرا میری طرف دیکھنا نفرت سے بھرا ہوا ہے۔ یعنی تو میری طرف نگاہِ کرم سے نہیں بلکہ ترش نگاہ سے دیکھتے ہو۔ لیکن میرے لئے اتنا کافی ہے کہ میں تجھے اب بھی یاد ہوں۔

11 ۱۳ وہ میری روح میں تحلیل ہو چکا ہے عرشؔ   اگر وہ مجھ سے جدا ہے چلو جدا ہی سہی

یہ شعر عرشؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس مقطعے میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اگر میرا محبوب ظاہراً مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ لیکن چلو ایسا ہی مان لیتے ہیں۔ مگر وہ میری روح میں اس قدر گھل مل ہوا ہے۔ کہ میں اُسے اپنے قلب سے ایک پل بھی دور نہیں پاتا۔ گویا شاعر کو اپنے محبوب کی جدائی کوئی عجیب چیز نہیں لگتی کیونکہ اس نے اپنے محبوب کو دل میں سما لیا ہے۔

2 Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

3

4

Scanned with CamScanner

T W T F S S
1 2 3 4 5
7 8 9 10 11 12
14 15 16 17 18 19
21 22 23 24 25 26
28 29 30 31
October 2014
M T W T F S S
1 2
3 4 5 6 7 8 9
10 11 12 13 14 15 16
17 18 19 20 21 22 23
24 25 26 27 28 29 30
November 2014
Saturday 20 SEP 2014
263-102 • WK 38

اکبر جے پوری

(غزل)

۱۔ کس کو معلوم ملے خاک میں منظر کتنے اپنے آئینے چھپائے ہیں سکندر کتنے

منفرد انداز ہیں دنیا کی

یہ شعر اکبر جے پوری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں نا پائیداری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز رہنے والی نہیں ہے۔ اس دنیا میں بے شمار ایسے مناظر بھی ہیں جن کا ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے خاک میں معدوم ہو چکے ہیں ساری دنیا کو فتح کرنے والا سکندر جس نے بے شمار دو بار سجائے تھے آج اُس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں کسی بھی چیز کو پائیداری حاصل نہیں ہے۔

۲۔ تشنہ لب ترسا کئے پیاس لئے آنکھوں میں اور محلوں میں چھلکتے رہے ساغر کتنے

یہ شعر اکبر جے پوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ یہ دنیا بھی کیا عجیب ہے ایک طرف سماج میں نادار اور مفلس لوگ تڑپ تڑپ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ عمر بھی اپنی پیاسی آنکھوں میں اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھتے ہیں تو دوسری طرف اسی سماج میں کچھ امیر لوگ محلوں میں عیاشی اور بے راہ روی کے مزے لوٹتے رہتے ہیں۔ گویا شاعر دنیا میں سماجی اور معاشرتی نابرابری کا ایک منفرد انداز میں نقشہ کھینچتے ہیں۔

۳۔ پرچم امن لئے پھرتے ہیں شہروں شہروں آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر کتنے

یہ شعر اکبر جے پوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں اگر سماج میں رہنے والے ان حکمرانوں، رہبروں اور رہنماؤں کی اصلیت کا پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو لوگ امن کا پرچار کرنے والے ہیں۔ اصل میں یہ ان کا صرف دکھلاوا ہوتا ہے۔ بس یہی لوگ امن کے نام پر لوگوں کے مابین فتنے فساد پھیلانے والے ہوتے ہیں۔

۴۔ کس طرح صدا دیتا صدا مجھ کو پتا یاد نہ تھا یوں تو بستی میں نظر آئے کھلے در کتنے

یہ شعر اکبر جے پوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں نے بستی میں کئی دروازے کھلے پائے۔ مگر میں اس بات سے باخبر نہیں تھا کہ کس دروازے پر جا کے مجھے میری حاجت پوری کی جاتی۔ کیونکہ اس دنیا میں اچھے بھلے لوگوں کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا میں جس در کی تلاش میں نکلا تھا وہ مجھے نہیں مل سکا ہمیں خالی ہاتھ واپس لوٹا۔

۵۔ دیکھ کر تشنہ لبی میری تعجب نہ کرو میں نے صحراؤں کو بخشے ہیں سمندر کتنے

یہ شعر اکبر جے پوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں امیر یا غریب ہونے میں دیر نہیں لگتی لہٰذا انسان کو اپنی دولت پر کبھی غرور نہیں کرنا چاہئے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ تم آج مجھے پیاسا اور تنہا دیکھ کر حیران مت ہو جاؤ۔ میں نے کئی صحراؤں کو سیراب کیا ہے اور خود پیاسا رہ گیا۔ گویا شاعر کی مراد یہ ہے کہ میں نے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے خود تکلیفیں برداشت کیں۔

—٭—

Scanned with CamScanner

ہمدم کاشمیری

غزل ۱

۱۔ ایسا نہیں کہ سر پہ سدا آسمان تھا
میرا بھی شہر میں کبھی کوئی مکان تھا

یہ شعر ہمدم کاشمیری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں دنیا کے بدلتے ہوئے نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ہر وقت کھلے آسمان تلے اپنی زندگی نہیں گزارتا تھا۔ میرا بھی اس ہنستے بستے شہر میں ایک عالیشان مکان تھا جس میں میں اپنی زندگی گزر بسر کرتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں شاعر فرماتے ہیں کہ زمانے نے ایسے کروٹ بدلی کہ میرا پھلتا پھولتا شہر اچانک صحرا میں تبدیل ہو گیا۔ اس سے پہلے میرے شہر کی ایسی حالت نہیں تھی۔

۲۔ اس شہرِ روشنی کے شہر میں ظلمت کرے گی راج
مجھ کو یقین تھا نہ تجھے ہی گمان تھا

یہ شعر ہمدم کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ کسی کو اس بات کا وہم و گمان ہی نہیں تھا کہ اس چمکتے ہوئے شہر کو اندھیرا ڈھانپ لے گا۔ شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ میرے شہر میں ظلم و جبر، تشدد و خوف یا دیگر منفی اثرات اپنے زد میں لے گے کہ میرا شہرا تاریکی میں بدل جائے گا۔

۳۔ دھویا نہیں گیا جو کسی برشگال میں
میری زمین پر وہ لہو کا نشان تھا

یہ شعر ہمدم کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں موجودہ دور کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ~~میری~~ دنیا میں بہت سارے ایسے مسائل ہے جن کا حل نکالا گیا۔ لیکن میری اس زمین پر قتل و غارت اور خونریزی کا جو نشان لگا ہوا ہے۔ زمانے کا کوئی ایسا حکمران پیدا ہی نہیں ہوا جو اس قتل و غارت کے سلسلے کو بند کرواتا۔ اس زمین پر خون کا ایسا نشان لگا ہوا ہے جو کسی موسلادھار بارش یا طوفان سے بھی نہیں مٹ سکا۔ گویا ~~ہمارے~~ ہماری سرزمین پر قتل و غارت کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

۴۔ ہمدم کو چپ لگی زمانہ گزر گیا
اس شہر خامشی میں وہ صاحب اذان تھا

یہ شعر ہمدم کاشمیری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں ایک طویل عرصے سے ہمدم خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ ~~اس~~ میرا یہ شہر جس میں آج خاموشی نے اپنے بادل منڈرائے ہیں میں ~~وہ~~ ایک مؤذن کی طرح لوگوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرتا تھا۔ گویا شہر میں خاموشی یعنی غفلت میں ڈوبا ~~ہوا~~ رہنا شاعر کے خاموش رہنے کی وجہ ہے۔

غزل ۲

۱۔ ایک بھی موسم میرے اندر نہ تھا
اور آنکھوں میں کوئی منظر نہ تھا

یہ شعر ہمدم کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میری زندگی میں کوئی ایسا ~~ط~~ قلب واقع پیش نہیں آیا جس سے میں اپنی زندگی کو خوشحال بنا سکتا۔ میری آنکھوں میں کوئی ایسا دلکش منظر بھی نہیں تھا جس سے مجھے فرحت و مسرت محسوس ہوتی۔ گویا شاعر نے اپنی زندگی میں صرف اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھا ہے۔ اور زندگی کو غموں اور پریشانیوں کے ذریعے گزر بسر کرتا رہا۔

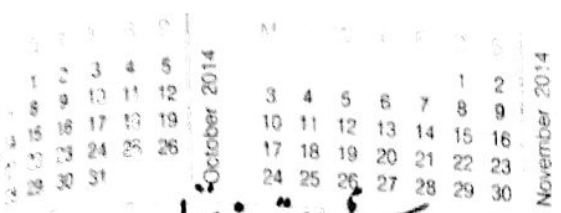

۲ میرے دائیں بائیں تھی پرچھائیاں
میرے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہ تھا

یہ شعر ہمدم کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں زندگی کی بے بسی کا اظہار بڑے لطیف انداز میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے چاروں طرف خوف، ظلم، ستم، جبر کی پرچھائیاں تھیں میں ان پرچھائیوں کو دور کرنا چاہتا تھا لیکن میرے ہاتھ میں کوئی ایسا پتھر نہیں تھا جس سے میں ان پرچھائیوں کو بھگاتا۔ گویا خوف و خطرے کے عالم میں انسان اتنا بے بس ہوتا ہے کہ اس کے پاس کوئی تدبیر ہی نہیں ہوتی ہے۔

۳ خواب اپنے کیا حقیقت ہو گئے
ہمیں کیا تھا اگر پیکر نہ تھا

یہ شعر ہمدم کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ حقیقت بھی اب خواب کی طرح محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ خواب میں ایسی چیز کو چھوا جاتا ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اسی طرح زندگی کی حقیقت بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ کوئی وجود ہے جس کے سہارے میں اپنے غموں سے چھٹکارا پا سکتا ہوں لیکن یہ محض ایک وہم ہے۔ ایسا کوئی وجود ہی نہیں ہے جو میرے غموں اور دکھوں سے مجھے نجات دلا سکے۔

۴ چھا گیا تھا شہر پر افسوں کوئی
چاند جب نکلا کوئی چھت پر نہ تھا

یہ شعر ہمدم کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے شہر میں اس قدر سناٹا چھایا ہوا تھا کہ لوگ اب ہار کر اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن اب چاند نکل آیا تھا یعنی کوئی ہمدرد آیا تھا جو لوگوں کی فریاد سن سکتا تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس چاند کا نظارہ کرنے کے لئے چھت پر بھی نہیں نکلا۔ گویا اب خوف و ہراس کا ماحول یہ تھا کہ چاند نکلنے پر بھی کوئی گھر سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتا۔

۵ اک صدا گونجی مکاں میں دیر تک
کیا تھا یہ ہمدم کوئی در پر نہ تھا

یہ شعر ہمدم کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ مکاں میں دیر تک کوئی آواز دیتا رہا۔ بظاہر دروازے پر کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازے پر موجود نہ ہونے کے باوجود بھی آواز دینے والا بڑی مدت آواز دیتا رہا اور میں نے جب غور سے دیکھا تو مجھے اپنے سوا کوئی اور نظر نہیں آیا۔

یہ پوری غزل کشمیر کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

* * *

M	T	W	T	F	S	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

August 2014

M	T	W	T	F	S	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30					

September 2014

شبیب رضوی

غزل

۱۔ کتاب بند سہی حرف تر کھلا رکھنا — مباحثے کا ہمیشہ ہی در کھلا رکھنا

یہ شعر شبیب کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں ایک انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ کہ ہمیں ہمیشہ گفتگو اور بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ خاموش رہنے کی وجہ سے شک و شبہات مزید بڑھ جاتے۔ لہٰذا انسان کے دل میں جو باتیں ہے ان کو دوسروں تک پہنچانے میں ہی فائدہ ہے۔

۲۔ سکوت شب سے بھی اُکتا کے لوٹ سکتا ہوں — میں کہہ کے آیا ہوں بچوں سے، گھر کھلا رکھنا

یہ شعر شبیب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں دل کا سکون حاصل کرنے کے لئے گھر سے دور نکلا۔ لیکن کیا معلوم رات کی خاموشی کب اور کس وقت مجھے ستانے لگے گی اور میں گھر کی طرف لوٹ جاؤں گا۔ ~~ہا~~ اس میں نے بچوں سے یہ بات ذہن نشین کی ~~ہا~~ کہ گھر کا دروازہ میرے لئے کھلا رکھنا۔

۳۔ ہماری شرط ہے کہ ہم پر ہو سایۂ رحمت — تمہاری ضد ہے کہ کوفے میں سر کھلا رکھنا

یہ شعر شبیب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ہماری مرضی یہ ہوتی ہے کہ ہم پر آپ ~~کا~~ کی رحمت کا سایہ ہو لیکن آپ ہمیں کوفے میں کھلا سر چلنے پر مجبور کرتے ہو۔ گویا انسان جو خود چاہتا ہے ویسا کبھی نہیں ہوتا۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے۔ اس شعر میں صنعت تلمیح سے کام لے کر شاعر نے ~~کا~~ کوفے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کوفہ وہی شہر ہے جہاں یزیدیوں نے امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہمشیرہ حضرت زینب علیہا السلام کو ننگے سر چلنے پر مجبور کیا۔

۴۔ شکستگی ہوئی ظاہر تو موت لازم ہے — کھلی ہواؤں کے دھارے پہ پر کھلا رکھنا

یہ شعر شبیب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ شکستگی کا دوسرا نام موت ہے انسان کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ آنے والی ہر مصیبت اور پریشانی کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ اگر انسان زندگی کی دشواریوں سے ڈر گیا تو یقیناً اس کے لئے موت لازم ہے گویا چلتے رہنا زندگی ہے اور رک جانا موت کے برابر ہے۔

۵۔ کسی کا ہاتھ بڑھے یا کھچے یہ اس کا نصیب — ہمارا فرض ہے دست ہنر کھلا رکھنا

یہ شعر شبیب رضوی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ہم اپنا فرض اور ذمہ داری نبھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور ہم نے بلا امتیاز اپنے ہنر مند ہاتھ ہر ایک کے لئے کھلے رکھے ہیں۔ اب اپنا اپنا نصیب ہے کہ کون ان ہنر مند ہاتھوں سے فیض اور فائدہ حاصل کرے اور کون محروم رہے۔ گویا شاعر ہر وقت اپنے آپ کو دوسروں کی مدد کے لئے تیار رہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

غزل ۲

۱۔ کتنی بھوکی ہے کتنی پیاسی ہے
زندگی دشتِ کربلا سی ہے۔

یہ شعر شبیب کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں موجودہ دور کے انسان کی زندگی کی خستہ حالی کو کربلا کے سانحے کی طرف مشابہت دیتے ہیں۔ شاعر فرماتے ہیں آج کل کے انسان کی زندگی ایسی وحشتناک اور دردناک ہے جیسے کربلا میں بھوک و پیاس اور اذیتاً سے بھری زندگی امام حسینؑ اور ان کے جانثاروں کی تھی۔ اس شعر میں شاعر نے صنعتِ تلمیح سے کام لیا ہے۔

۲۔ سب گئے شمع دل جلائے ہوئے
خیمہ خیمہ بہت اُداسی ہے

یہ شعر شبیب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں واقعہ کربلا کی دردناک داستان بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر ایک نے کربلا میں اپنے فرائض کے عین مطابق اپنا حق ادا کیا۔ اور شہید ہو گئے۔ اب ہر خیمے میں اداسی ہی اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ کیونکہ اب خیموں میں کچھ گنی چنی عورتیں اور بچے باقی رہے تھے اسلئے ہر خیمہ اداسی میں مبتلا تھا۔ شاعر نے آج کے دور کی انسانی زندگی کو اسی واقعے کی مناسبت سے ~~[illegible]~~ جوڑا ہے۔

۳۔ اس نے کتنی لطیف بات کہی
خود شناسی خدا شناسی ہے

یہ شعر شبیب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں ایک معروف قول "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" کا ترجمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو بھی پہچان لیا۔ گویا جو انسان اپنے آپ سے بے خبر ہو وہ اللہ تعالی کو بھی پہچان نہیں سکتا۔ اللہ تعالی کو پہچاننے کے لئے انسان کو سب سے پہلے اپنے آپ کو پہچاننا ضروری ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۴۔ پھیل جائے تو اِک کتاب بنے
بات کہنے میں جو ذرا سی ہے

یہ شعر شبیب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جب ایک بات جو ~~[illegible]~~ کہنے میں تھوڑی سی ہوتی ہے کی تشریح کی جاتی ہے تو وہی بات پھیل کر ایک کتاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات کے سمجھنے اور تشریح کرنے والے تک ہے کہ وہ بات کو کس حد تک سمجھ سکتا ہے۔

۵۔ زندگی خود کشی نہ کرلے کہیں
ہر تمنا خفا خفا سی ہے۔

یہ شعر شبیب رضوی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں جب انسان کی تمنائیں اور خواہشیں پوری نہیں ہوتی ہے تو وہ اپنی زندگی سے بیزار ہوتا ہے۔ اور محرومیوں کا اور نا اُمیدی کا احساس اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ انسان خودکشی کو ہی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگتا ہے۔

Notes prepared by ~~Shehnaz~~ Ahmad Dar
Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief M.A. B.Ed.

Scanned with CamScanner

258-107 • WK 38
SEP 2014
15 Monday

حصہ نظم (شاعری) ؛ غزلیات ؛

؛ سوالات ؛

میر تقی میر

سوال 1:۔ شاعر نے دل ستم زدہ کو کیوں تھام لیا ؟

جواب:۔ شاعر کے سامنے جب کوئی اُس کے محبوب کا نام لیتا ہے تو وہ نام سُن کر شاعر اس شخص پر رشک کرتا ہے اور بے چین ہوتا ہے اور بڑی مشکل سے دل کو تھام لیتا ہے۔

سوال 2:۔ دونوں غزلوں میں ایسا شعر تلاش کیجیے جس میں شاعرانہ تعلی موجود ہو ؟

جواب:۔ میر تقی میر نے اس شعر میں صنعتِ تعلی کا استعمال کیا ہے :۔

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شعر نے روئے زمین تمام لیا

سوال 3:۔ کھوپڑی نے کون سی پتے کی بات بتائی ؟

جواب:۔ شاعر جب اچانک ایک مردہ انسان کی کھوپڑی سے ٹکراتا ہے اور اُس کا پیر اس کھوپڑی پر پڑتا ہے تو کھوپڑی نے شاعر سے مخاطب ہو کر ایک بہترین بات بتائی کہ اے بے خبر انسان ذرا دیکھ کر اپنے پاؤں زمین پر رکھا کر میں بھی کبھی کسی انسان کے سر کی عزت تھی۔ آج تم مجھے اپنے پیروں تلے روندتے چلے گئے یہ مت بھولنا کہ کل تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔

سوال 4:۔ دوسری غزل کے تیسرے شعر میں حضرت موسیٰؑ سے متعلق تلمیح کو بیان کیجیے ؟

جواب:۔ حضرت موسیٰؑ اللہ کے پیغمبر تھے اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرتے تھے جس وجہ سے ان کا لقب کلیم اللہ پڑ گیا۔ وہ کوہِ طور پر جا کے اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے تھے۔ وہی پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نور کی تجلی کا دیدار کیا جس کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہوئے اور کوہِ طور جل کر راکھ ہو گیا۔ شاعر نے اسی مناسبت سے دوسری غزل کے تیسرے شعر میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

— ؟ —

Scanned with CamScanner

خواجہ حیدر علی آتش

سوال 1:- اس غزل میں اس شعر کی نشاندہی کیجیئے جس میں انسان کی بے ثباتی کا ذکر ہے؟

جواب:- اس شعر میں آتش نے انسان کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے:-

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناميوں کے نشان کیسے کیسے

سوال 2:- شاعر نے غم و غصہ، رنج و اندوہ کو اپنے مہربانوں میں کیوں شمار کیا؟

جواب:- شاعر نے غم و غصہ، رنج و اندوہ کو اپنے مہربانوں میں اسلیے شمار کیا ہے کیونکہ ان کے مطابق خوشی غموں کے درمیان ایک وقفہ ہے اور غم انسان کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں۔

شاد عظیم آبادی

سوال 1:- ان مرکبات کے معنی لکھیے:-

اعجازِ مے = شراب کا کرشمہ   دلِ مضطر = بے قرار دل، بے سکون دل
رونقِ بزم = محفل کی رونق اور روشنی۔

فانی بدایونی

سوال 1:- شاعر کس کی نظر کے بدلے میں اپنی جان جیسی قیمتی چیز دینا چاہتا ہے؟

جواب:- شاعر محبوب کی ایک محبت بھری نظر کے بدلے میں اپنی جان جیسی قیمتی چیز دینا چاہتا ہے۔

سوال 2:- دوسرے شعر میں دل کی بستی کو "نرالی بستی" کیوں کہا گیا ہے؟

جواب:- شاعر نے دل کی بستی کو "نرالی بستی" سے اسلیے مشابہت دی ہے کیونکہ دل ایک ایسی بستی ہے جو ایک بار اُجڑ جانے سے (یعنی ٹوٹ جانے سے) دوبارہ بسائی نہیں جاتی۔

NOTES

Scanned with CamScanner

عرش صہبائی

سوال 1:۔ شاعر نے حصارِ ذات سے نکل نہ سکنے کی کیا وجہ بتائی ہے؟
جواب:۔ شاعر حصارِ ذات سے نکل نہ سکنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آس پاس کے ماحول نے مجھے اپنی ہی ذات کے خول میں قید کر دیا ہے۔ میرے لئے اس قید کی دیواروں سے نکلنا بہت دشوار ہے۔ گویا شاعر اپنے اردگرد کے ماحول کو ناپسند یدہ ہونے کے باوجود بھی مجبوراً اسی ماحول میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

اکبر جے پوری

سوال 1:۔ امن کا پرچار کرنے والوں کی آستینوں میں کیا چھپا ہوا ہے؟
جواب:۔ امن کا پرچار کرنے والوں کی آستینوں میں خنجر چھپا ہوا ہے یعنی اصل میں فساد اٹھانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو امن کا نعرہ دیتے ہیں۔

ہمدم کاشمیری

سوال 1:۔ پہلی غزل کا دوسرا شعر پڑھکر بتایئے کہ شاعر کو کس چیز کا گمان نہیں تھا؟
جواب:۔ شاعر کو اپنے امن والے شہر میں ظلمت یعنی جبر، ظلم، تشدد اور اختلافات وغیرہ ہونے کا گمان نہیں تھا۔

سوال 2:۔ صنعتِ تضاد سے کیا مراد ہے؟ ہمدم کاشمیری کی دونوں غزلوں میں صنعتِ تضاد والے اشعار تلاش کیجئے۔
جواب:۔ شعر میں دو یا دو سے زیادہ ایسے الفاظ ہوں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے دن رات، صبح شام، اچھا برا وغیرہ صنعتِ تضاد کہلاتا ہے۔

NOTES

۱۔ اس روشنی کے شہر میں ظلمت کرے گی راج — ہم کو یقین تھا نہ تجھے ہی گمان تھا
۲۔ میرے دائیں بائیں تھی پر چھائیاں — میرے ہاتھوں میں کوئی پتھر نہ تھا

ان اشعار میں صنعت تضاد کا استعمال ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

شبیب رضوی

سوال 1 :۔ ایسے تین اشعار قلمبند کیجئے جن میں واقعہ کربلا کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔
جواب :۔ مندرجہ ذیل اشعار ہیں واقعہ کربلا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :۔

غزل نمبر ۱۔ ۱۔ ہماری شرط کہ ہم پر ہو سایہ رحمت
تمہاری ضد ہے کہ کونے میں سر کھلا رکھنا

غزل نمبر ۲ ۲۔ کتنی بھوکی ہے کتنی پیاسی ہے
زندگی دشتِ کربلا سی ہے

غزل نمبر ۲ ۳۔ سب گئے شمع دل جلائے ہوئے
خیمہ خیمہ بہت اُداسی ہے

سوال 2 :۔ پہلی غزل کے دوسرے شعر میں کیوں بچوں کو گھر کھلا رکھنے کے لئے کہا گیا؟
جواب :۔ شاعر دل کا سکون ڈھونڈنے کے لئے گھر سے رات کے اندھیرے میں نکلتا ہے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی باخبر ہوتا ہے کہ رات کی خاموشی اور تنہائی سے تنگ آکر وہ واپس لوٹ سکتا ہے اس لئے بچوں سے دروازہ کھلا رکھنے کے لئے کہتا ہے۔

سوال 3 :۔ پہلی غزل کے تیسرے شعر میں شاعر نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے مختصر طور پر بیان کیجئے؟
جواب :۔ شاعر نے اس شعر میں واقعہ کربلا کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کربلا وہ جگہ ہے جہاں امام حسین علیہ الصلواۃ والسلام اور ان کے جانثاروں پر یزیدی فوج نے پانی بند کیا تھا۔ یہ حق اور باطل کے درمیان ایک جنگ تھی۔ اس جنگ میں امام حسین علیہ اسلام سمیت 72 بہتو سپہ سالاروں کو یزیدیوں نے شہید کیا۔ ان کی شہادت کے بعد امام حسین علیہ اسلام کی بہن حضرتِ زینب علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کوفہ کے بازار میں ننگے سر چلنے پر مجبور کیا جس کا نقشہ شاعر نے ~~اسکا~~ اس شعر کی صورت میں کھینچا ہے۔

Notes prepared By Sheraz Ahmad Dar.

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

مرزا محمد رفیع سودا

حالاتِ زندگی:-

مرزا محمد رفیع نام اور سودا تخلص۔ والد کا نام مرزا محمد شفیع جو تجارت کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ سودا 1713ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ قدیم رسم و رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے ہی نہایت ذہین تھے۔ اپنی غیر معمولی صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر سودا نے بہت جلد نام پیدا کر لیا اور دلی کے سب سے ممتاز شاعر تسلیم کئے جانے لگے۔ بادشاہ وقت شاہ عالم بھی ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ گزر اوقات کے لئے فوج میں سپاہی ہو گئے۔ مگر جلد ہی اس ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ جب دہلی کے حالات نے انہیں بہت مجبور کیا تو لکھنو کی طرف رُخ کیا۔ جہاں نواب شجاع الدولہ اور ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے کی خاطر خواہ عزت دی۔ تقریباً 70 سال کی عمر میں 1781ء میں لکھنؤ میں ہی انتقال کیا۔

شاعرانہ خوبی:-

سودا مزاجاً قصیدے کے شاعر ہیں، لیکن ان کی غزلیں بھی زبان و بیان کی دلآویزی اور لب و لہجہ کی وجہ سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ سودا کو ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ اردو کے اکثر اصناف سخن پر انہوں نے کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد و ہجو میں وہ نام پیدا کیا کہ آج تک کوئی جواب نہ ہوسکا۔ سودا کے کلام میں ہندوستان کے رنگ و بو کا احساس نمایاں ہے یعنی فارسی شعرا کی تقلید میں ہندوستان کے رسوم، اشخاص وغیرہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ قصیدہ گوئی میں انکا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ان کے قصائد ہر چیز پر بھاری ہیں۔

Notes Pepared By Gumgeen Sheraz Dar.M.A B.Ed. 7889726757

Scanned with CamScanner

1931

251-114 • WK 37
SEP 2014
08 Monday

رسا جاودانی

حالاتِ زندگی :-

رسا جاودانی کا اصل نام عبدالقدوس ہے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ منور دلو تھا جو پیشے سے ایک تاجر تھے۔ رسا جاودانی کی ولادت 7 جولائی 1901ء میں بھدرواہ میں ہوئی جس کو اپنی فطری حسن کی وجہ سے چھوٹا کشمیر کہا جاتا ہے۔ آپ کے والد کو تجارت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ رسا نے ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی ڈگری حاصل کر کے ریاستی محکمہ میں ملازمت اختیار کی۔ وہ برسوں تک فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ آپ نے 27 مئی 1979ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

شاعرانہ خوبی :-

شعر گوئی کے علاوہ رسا جاودانی کو گانے بجانے سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ آپ کی شاعری میں اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ آپ کی غزلوں کا موضوع حسن و عشق پر مبنی ہے۔ آپ نعتیں بھی لکھتے تھے۔ نظموں میں آپ نے فطرت کے مناظر اور دیگر پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے۔ کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔ آپ کی کشمیری شاعری کو کافی مقبولیت ہوئی۔ لالۂ صحرا اور نظمِ ثریا آپ کے دو شعری مجموعے ہیں۔

تمنا چھُم دِلس منٛز دیدارُک
پوٗرِ کرتَم منٛز چھُم ارمان چھولوٗئی
ژٔ چھُم خاطری تِتھئے منٛز غمگینس
ییٚنہ روزِتم یا بنِم داماں چھولوٗئی

(غمگین ڈار)

Gumgeen Dar
Newgam Ehrari Sharief

مرزا سلامت علی دبیر

حالاتِ زندگی:-

مرزا سلامت علی نام اور دبیر تخلص تھا۔ 1803ء میں دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ تعلیم لکھنو میں حاصل کی۔ درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شوقین تھے اور شعر و شاعری سے بھی طبعاً مناسبت تھی، میر مظفر حسین ضمیر کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد بہت اچھے مرثیہ گو ہوئے، بعد میں اپنے استاد سے بھی زیادہ شہرت پائی۔ اپنی شہرت کی وجہ سے دربار اودھ نے سرپرستی کی پیشکش کی۔ دبیر نے اپنی ساری عمر مرثیہ گوئی کی اور اس فن کے بڑے استاد ہوگئے۔ غدر کے زمانے تک دبیر نے لکھنو سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لیکن آخرکار مرشدآباد اور پٹنہ عظیم آباد جانا پڑا اور وہیں 1875ء میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات / مرثیہ نگاری:-

مرزا دبیر نے کم از کم تین ہزار مرثیے کہے ہیں۔ رباعی، سلام اور نوحے اُن کے علاوہ ہیں۔ جوشِ بیان ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ سینکڑوں مراثی کے علاوہ آپ نے مثنوی، قصیدہ، رباعی، سلام اور قطعہ کی صنفوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اپنی ساری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور اس فن کے بڑے استاد ہوگئے۔ دفترِ ماتم، رباعیاتِ دبیر، ابواب المصائب اور رسالۂ مرزا دبیر آپ کی اہم کتابوں کے نام ہیں۔ آپ کے کلام میں بھی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو میر انیس کے یہاں پائی جاتی ہے۔ مراثی کے مدح والے حصوں میں زبان پُرشکوہ اور علمی مضامین وافر ہیں اور رزم والے حصوں میں زورِ بیان عیاں ہے جبکہ بین کے اظہار میں زبان کی سادگی، سلاست، روانی اور جذبات نگاری مرزا دبیر کے مرثیوں کو اعلیٰ مقام بخشتی ہے۔

Sunday 07

NOTES

سَتھ چھم دِلس میٖہ آگھو، وَتھ ہاوٕتم میٖہ اچھٕ
کرٕہے بہٕ نعت خوانی وندٕہے بہٕ زندگانی
گژھٕہا مکس مدینس آرزو چھ غمگینس
ژٕلہٕ ہیم پریشانی وندٕہے بہٕ زندگانی
(غمگین ڈار)

Gumgeen Dar
Nowgam Ehrari Sharief

Scanned with CamScanner

نظیر اکبر آبادی

حالاتِ زندگی:-

ولی محمد نام اور نظیر تخلص ۔ 1724ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ آپ اپنے والدین کے لاڈلے تھے ۔ اس لئے پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی ۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد کاظم اور ملا ولی سے حاصل کی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر نے دہلی چھوڑ دی اور آگرہ آکر محلہ تاج گنج میں مقیم ہوئے۔ یہاں کی آب و ہوا اتنی راس آئی کہ نظیر اکبر آبادی ہو گئے۔ رواج کے مطابق فارسی زبان کا مطالعہ کیا۔ عربی زبان سے بھی واقفیت تھی بلکہ کہا جاتا ہے کہ نظیر عربی اور فارسی زبانوں کے بڑے ماہر اور عالم تھے۔ اس کا اندازہ ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ بالآخر 1830ء میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

نظیر کا شعری فن عوامی انداز کا تھا۔ انہوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں مگر ان کا اصلی رنگ ان کی نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی نظمیں عام طور پر سیدھی اور صاف ہیں مگر بہت ہی دلکش اور خوبصورت ہیں۔ نظموں کی خاصی تعداد مذہبی رہنماؤں، تہواروں اور ملکی تفریحوں سے متعلق ہیں۔ آپ نے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ نے عام روش سے ہٹ کر مختلف چیزوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ زمانے نے آپ کو بازاری شاعر بھی کہا اور نظر انداز کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے جب شاعری میں انقلاب آیا تو آپ کی قدر و منزلت ہونے لگی۔ آپ کی نظموں میں آدمی نامہ، مفلسی، روٹی نامہ اور مکافات وغیرہ مشہور ہیں۔

Scanned with CamScanner

پنڈت برج نراین چکبست

حالاتِ زندگی:-

اصلی نام پنڈت برج نراین اور چکبست خاندانی لقب تھا۔ 1882ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پنڈت اودِت نراین چکبست تھا۔ وہ بھی شاعر تھے اور تخلص یقین تھا۔ یہ اصل کشمیری برہمن تھے۔ تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہی حاصل کی۔ وکالت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اپنایا۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں رائے بریلی گئے اور واپس لوٹنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر فالج کا شکار ہوگئے اور چند ہی گھنٹوں میں 12 فروری 1926ء میں انتقال کر گئے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

چکبست کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ آپ آتش اور انیس کے دلدادہ تھے۔ دراصل آپ کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو ملک کی زبوں حالی سے متاثر تھا۔ آپ کی غزلوں میں غالب کا سا فلسفیانہ انداز اگرچہ کم ہی ہے لیکن بہت خوب ہے۔ چکبست حقیقت میں قومی شاعر تھے۔ ان کا مشرب یہ تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن کا دامن پکڑے بغیر اگر مغربی تہذیب میں کوئی اچھی بات ہے تو اسے اختیار کر لینا چاہئے۔ اسی خیال کے تحت وہ ہوم رول کے مطالبہ کے دل سے حامی تھے۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام "صبحِ وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے متعدد قومی لیڈروں کی وفات پر درد انگیز مرثیے کہے ہیں۔ رامائن کو آپ نے اس خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ شاید ہی کوئی اور شاعر کر سکے۔ بہرحال اپنے کلام میں انہوں نے اس زمانے کے سیاسی حالات کو بڑی خوبی اور کامیابی سے پیش کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

محمد حسین آزاد

حالاتِ زندگی:-

محمد حسین آزاد 1830ء میں دہلی میں پیدا ہوئے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ اردو زبان کا پہلا اخبار "اردو اخبار" 1856ء میں مولوی محمد باقر نے ہی دہلی سے نکالا۔ آزاد نے عربی فارسی کی تعلیم دہلی کالج سے حاصل کی۔ اردو نثر و نظم لکھنے کی صلاحیت اور استعداد انہوں نے اسی کالج سے فراہم کی۔ 1857ء کے ہنگامے میں آپ کے والد کو انگریزوں نے پھانسی دی۔ آزاد کچھ عرصہ تک مارے مارے پھرتے رہے اور آوارہ گردی کی اس کے بعد لاہور میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ لاہور کے سرکاری کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد 1886ء میں ایران کا سفر کیا۔ انگریز سرکار کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا ہے۔ اپنی بیٹی کے انتقال سے انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ دماغی توازن کھو بیٹھے۔ اسی حالت میں 1910ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

محمد حسین آزاد کو جدید اردو نظم کا بانی کہا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ آپ کی زبان سادہ اور بے تکلف ہے جو پڑھنے والے کو اس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے کہ وہ پوری عبارت پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ اپنی تحریر میں موسیقیت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں بھی نظم کا سا لطف آتا ہے۔ آزاد کی تحریک پر ہی انجمن پنجاب لاہور کے زیرِ اہتمام ایک نئی طرح کے مشاعرے کی بنیاد (1874 سن) رکھی گئی جو ہر مہینے منعقد ہوتا تھا۔ شبِ قدر، موسمِ زمستان، صبحِ امید، حبِ وطن وغیرہ اس طرز کی نظمیں ہیں جو انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ آزاد کی "نیرنگِ خیال" بھی ایک اہم یادگار ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "آبِ حیات" ہے۔ علاوہ بریں ان کی تصنیفات "سخندانِ پارس" اور "دربارِ اکبری" کافی مقبول ہوئیں۔

NOTES

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

حالاتِ زندگی:-

ڈاکٹر سر محمد اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام اماں بی بی تھا۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انہوں نے بی اے اور بعد میں فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی تعلیمی زندگی میں اقبال نے کئی لوگوں سے استفادہ کیا۔ سیالکوٹ میں میر حسن اور لاہور میں تھامس آرنلڈ نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اقبال اورینٹل کالج لاہور اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ علم و ادب سے زندگی بھر لگاؤ رہا اس وجہ سے ان کا شمار دنیا کے بڑے عالموں اور مفکروں میں ہوتا ہے اور علامہ بھی کہلاتے ہیں۔ اقبال کو اپنے کشمیری نژاد ہونے پر بہت ہی ناز تھا۔ زندگی کے آخری برسوں میں اقبال کئی طرح کے امراض میں مبتلا رہے۔ بہت علاج کیے گئے لیکن صحت یاب نہ ہوئے۔ آخر کار 61 سال کی عمر میں 1938ء کو لاہور میں انتقال کیا اور شاہی مسجد لاہور کے احاطے میں مدفون ہیں۔

شاعرانہ خصوصیات:-

اقبال اردو اور فارسی کے مشہور اور اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں۔ انہوں نے نثر میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں، مگر ان کی شہرت کا باعث ان کی شاعری ہے۔ اردو کلام میں اقبال کے شعری مجموعوں میں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کافی مشہور رہیں۔ فارسی میں اسرارِ خودی، پیامِ مشرق، جاوید نامہ وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ اقبال ایک صاحب پیام شاعر تھے۔ مادیت کے مقابلے میں وہ روحانیت کے ترجمان تھے لیکن ان کی روحانیت ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی سے عبارت نہیں تھی۔ روحانیت سے ان کی مراد اپنے جوہرِ وجود کی پہچان اور اس جوہر کو زیادہ سے زیادہ چمکا دینا ہے۔ مومن کی دنیا حوصلہ اور امید کی دنیا ہے۔ مایوسی اقبال کے ہاں کفر ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں ایک نیا فلسفہ بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری میں عمل کا پیغام ملتا ہے۔ وہ بے عملی کو موت کے برابر سمجھتے ہیں۔ وہ بار بار اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ زندگی دراصل آگے بڑھتے رہنے اور ایک بلند مقصد سامنے رکھنے کا نام ہے۔ وہ خودی کی تربیت پر بھی زور دیتے ہیں اور عام سطح سے بلند ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال جیسے شاعر اور انسان آئے دن پیدا نہیں ہوتے یہ اپنی قوم کے لئے انمول ہوتے ہیں۔

NOTES

Scanned with CamScanner

مرزا محمد لیسین بیگ

حالاتِ زندگی:-

مرزا محمد لیسین بیگ ۱۹۴۳ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جموں سے بی۔اے اور ایف۔اے کے امتحانات پاس کئے۔ بعد میں جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز میں لائبریرین کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ علی گڑھ سے بی۔لب کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ریاستی سرکار کے مختلف محکموں میں کام کرتے رہے۔ آپ کا شمار اردو کے جدید شاعروں میں کیا جاتا ہے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

مرزا محمد لیسین بیگ نے اپنی شاعری کا آغاز کالج کے زمانے سے ہی کیا۔ انہوں نے اردو کی اکثر شعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی انفرادیت ان کی نظموں میں ہی کھل کر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں عصری مسائل کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ان کی غزلوں کا محبوب ترین موضوع حسن وعشق ہے۔ زبان و بیان بھی بہت لطیف ہے۔ آپ کی بعض نظمیں گیت کا لطف دیتی ہیں۔ آپ کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "شاخ صنوبر کے تلے" آپ کی کلچرل اکادمی کی ملازمت کے دوران ہی شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے جو "دہر آشوب" کے عنوان سے ۱۹۹۱ء میں چھپا ہے۔ آپ ڈوگری اور پنجابی زبانوں میں بھی شعر کہتے تھے۔ ڈوگری میں "شبد امرت" کے عنوان سے آپ کی ایک طویل نظم شائع ہو چکی ہے۔ آپ کا شمار اردو کے جدید شعراء میں کیا جاتا ہے۔

NOTES

میر ببر علی انیسؔ

حالاتِ زندگی :-

میر ببر علی انیس ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر خلیق اور میر حسن دادا کا نام تھا۔ اس زمانے میں ان کا خاندان علوم و فنون اور زبان دانی کے لئے مشہور تھا۔ آپ نے تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں پائی۔ انیس بچپن سے ہی ورزش کے شائق اور حسنِ تناسب کے دلدادہ تھے اور اپنی خاندانی عزت کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ میر انیس کا مطالعہ کافی وسیع تھا وہ عربی اور فارسی پر اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی قناعت کا یہ حال تھا کہ وہ پیسے کی لالچ میں کبھی ایک حرف کسی کی تعریف میں نہیں لکھا ہاں تحفہ تحائف قبول کرنے میں انکار نہیں تھا۔ میر انیس نے لکھنؤ کی تباہی کے بعد پٹنہ، بنارس، حیدر آباد اور الہ آباد کا سفر کیا اور بخار کی وجہ سے ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

میر انیس کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ اس لئے یہ فن اپنے بزرگوار سے سیکھا اور خوش قسمتی سے ان کی زندگی میں ہی مشہور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس نے تقریباً دو ڈھائی لاکھ سے زیادہ اشعار کہے۔ جن میں کچھ غزلیں، اور کچھ رباعیاں اور باقی سب مرثیے ہیں۔ انہوں نے اردو میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو ایک اعلیٰ درجہ دیا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ایک بات کو کئی ڈھنگ سے ادا کرنے میں ماہر تھے۔ مرثیہ گوئی کے علاوہ میر انیس کو رباعیات گوئی میں بھی استاد تسلیم کیا گیا ہے۔ اُن کی چست رباعیوں میں علم و حکمت اور اخلاق کے نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ اُن کی بعض رباعیات ایسی زوردار اور چست ہیں کہ وہ ضرب المثل کے طور پر دہرائی جاتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

جگت موہن لال رواں

حالاتِ زندگی:-

جگت موہن لال نام اور رواںؔ تخلص تھا۔ آپ 14 جنوری 1889ء کو اُتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری منشی گنگا پرشاد تھا۔ آپ کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب آپ کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ آپ کی سرپرستی آپ کے بڑے بھائی کنہیا لال نے کی۔ ان ہی سرپرستی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے کے بعد ایم۔اے اور ایل،ایل بی کی ڈگریاں حاصل کی۔ اناوہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے وکالت کا پیشہ اپنایا تھا اور اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے کافی شہرت پائی۔ تا زندگی نے وفا نہ کی بالآخر 45 سال کی عمر میں 1934ء میں وفات پا گئے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

جگت موہن لال رواں کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ آپ عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے غزلیں، نظمیں قطعات اور رباعیات بھی لکھی ہیں۔ "روحِ رواں" آپ کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جو 1928ء میں شائع کیا گیا۔ آپ کے کلام میں اخلاقیات، فلسفہ، سائنس اور انسانی جذبات اور احساسات جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ آپ کے اندازِ بیان میں سلاست اور روانی ہے۔ آپ کی رباعیات کا خاص موضوع دنیا کی بے ثباتی (ناپائیداری) ہے۔

Scanned with CamScanner

خواجہ الطاف حسین حالیؔ

حالاتِ زندگی:-

الطاف حسین نام اور حالیؔ تخلص تھا۔ 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام ایزد بخش تھا۔ آپ کی عمر صرف نو برس کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بچپن ہی میں آرام و مصائب دیکھنے پڑے۔ آپ کی پرورش آپ کے بڑے بھائی نے کی۔ رواج کے مطابق قرآن شریف اور بعد میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ 17 سال کی عمر میں آپ کی شادی کر دی گئی۔ مگر شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی۔ اس سے آپ کی علمی استعداد روز بہ روز بڑھتی گئی۔ دہلی آکر مرزا غالبؔ کی صحبت میں رہے۔ لیکن 1857ء کے انقلاب کے ساتھ ہی گھر واپس جانا پڑا۔ پھر مصطفٰے خان شیفتہ سے بھی ملتے رہے۔ ان سے ہی آپ نے اصلیت و سادگی کا سبق سیکھا لیکن شیفتہ سے زیادہ سرسید کا اثر قبول کیا۔ آپ نے 1914ء میں پانی پت میں انتقال کیا اور وہی مدفن ہے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

حالی اردو کے بڑے اور اعلیٰ پائے کے شاعر شمار ہوتے ہیں اور ساتھ ادیب بھی۔ شعر گوئی کی طرف آپ کا فکری رجحان تھا۔ آپ نے اردو شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں کے علاوہ آپ کی نظمیں زیادہ مقبول ہوئی۔ حالیؔ کی زبان سیدھی، صاف و پاک اور مبالغے سے دور تھی۔ جھوٹ، تصنع اور بناوٹ کا اُن کی شاعری میں شائبہ نہیں۔ سرسید کی فرمائش پر آپ نے "مدو جزر اسلام" تخلیق کی جو "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" آپ کی مشہور نظمیں ہیں۔ اردو نثر میں آپ کی قابلِ دید اور قابلِ قدر تصانیف "یادگار غالب" "حیات سعدی"، اور حیات جاوید ہیں۔ حالیؔ کا سب سے اہم کارنامہ "مقدمہ شعر و شاعری" ہے۔ اس کتاب سے اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز ہوا۔

NOTES

Notes prepared By Sheraz Ahmad Dar. M.A. B.Ed.

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

شہر آشوب
اور سودا آزات
Page 115-133

دیگر اصناف کے خلاصے

(خلاصہ) قصیدہ شہر آشوب

یہ قصیدہ محمد رفیع سودا نے تحریر کیا ہے۔ یہ قصیدہ اپنے دور کی معاشرتی، تمدنی اور معاشی بدحالی کی ترجمانی کرتا ہے۔ جب دہلی احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی سودا نے اس قصیدے میں اُسی دور کی خستہ حالی کا نقشہ بڑے دلکش انداز میں کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ آغاز میں شاعر نے متکلم کی زبان سے سودا کے شاعرانہ فضل و کمال کی تعریف کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ سودا کی یہ نظم اعلیٰ معیار کی ہے۔ جب ایک ایک مخاطب سودا سے یہ سوال کرتا ہیں کہ آرام اور خوشحالی زندگی گزارنے کی کیا صورت ہے تو سودا جواب دیتے ہیں کہ اس معاملے میں فرشتے بھی تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ شاعر فرماتے ہیں کہ لوگ ذریعہ معاش کی تلاش میں پریشانیوں اور الجھنوں کے شکار ہوگئے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ جو گھوڑا لے کر اس کی نوکری کرتا ہے وہ تنخواہ کا محتاج رہتا ہے۔ تجارت کا بھی یہی حال ہے جو چیزیں ایران کے شہر اصفہان سے خریدی جاتی ہیں انہیں وہ بیچنے کے لئے دکن پہنچانی پڑتی ہے۔ شاعروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کسی معاشی پریشانی کے شکار نہیں ہے وہ بھی اسی ستم سے اب دور نہیں ہے۔ مولوی کو بلند آواز میں پڑھنے پر ہی دو روپے ملتی ہے۔ استادوں کا بھی یہی حال ہے اس کی وقعت صرف اتنی ہی ہے وہ مسور کی دال کا ایک پیالہ اور جو کی دو روٹیاں بڑی مشکل سے میسر کر پاتا ہے۔ شاعروں کے طعنوں سے شیخ بھی نہیں بچتے۔ ملا حضرات عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔ اس دنیا میں آرام، چین اور سکون کا فقط نام ہی ہے۔ حقیقتاً دنیا میں رہ کر یہ چیزیں حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس بات پر بھی کسی کو یقین نہیں ہے کہ دوسری دنیا یعنی آخرت میں یہ چیزیں، آرام، سکون، اور خوشحالی حاصل ہوگی۔ یہ بھی کہنے والے کا صرف وہم و گمان اور خیال ہے۔ اس دنیا میں روزی روٹی کی فکر لاحق ہے اور آخرت میں اپنے اعمال کا حساب و کتاب دینے کا خوف و دہشت ہے۔ رہی آسودگی، آرام وہ نہ تو یہاں میسر ہے اور نہ ہی وہاں ہے

ختم

Scanned with CamScanner

نعت (خدام)

اس نعت میں رساجاودانی نے پوری عقیدت و احترام کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس نعت میں شاعر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لئے غمخوار بن کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی تخلیقیت کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انسانیت کا جنازہ نکل چکا تھا اور سارے عالم میں جہالت اور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پورا عالم منور اور مجلیٰ ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے بے چین اور بے قرار دلوں کو قرار پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے آدمیت کو شرف و عزت حاصل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں نے زمین کا رتبہ اور شان عرش اعلیٰ سے بھی زیادہ بڑھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہربانیاں عالم انسانیت کے لئے برابر ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور محبت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے یکساں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور شان اللہ تعالیٰ نے اس قدر بلند فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک کے دل میں بسے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کے ساتھ بھی شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستوں میں کانٹے بچھائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی اس کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مخلصانہ اور ہمدردانہ رویہ اپنایا اور ان ~~بھی~~ پر بھی شفقت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہمیشہ رنجشوں اور نفرتوں سے پاک و منزہ رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار دیکھ کر ہر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و عظمت کے گیت گنگناتے رہے۔

فداچانہن وتن زو جان میو لگوئی
یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ژٕ چھکھو ایمان میو لگوئی
کرتہٕ اکھو نظراہ میہ عیب دارس
برتہٕ ازمعرفت دامان میو لگوئی

(غمگین ڈار)

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

Scanned with CamScanner

مرزا سلامت علی دبیر کی مرثیہ

حضرت علی اصغر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے پانی مانگنا

میدان کربلا میں یزید بد بخت نے دریائے فرات پر پہرے بٹھائے اور حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کیا۔ ریگستان میں تپتی ہوئی دھوپ میں گرمی کی شدت کی وجہ سے پیاس کو بڑوں کے لئے قابل برداشت نہیں تھا۔ لیکن امام حسین علیہ اسلام کے چھ ماہ کے بچے علی اصغر رضہ پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئے تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام چھے مہینے کے علی اصغر رضہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے یزیدی فوج کے قریب پہنچے۔ وہ اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ یزیدی فوج پانی فراہم کریں گے۔ امام حسین علیہ اسلام چھ مہینے کے بچے کے چہرے سے پردہ ہٹا کر یزیدی فوج سے سوال کرنے لگے کہ شمر اور عمر سعد کے سامنے میں گنہگار ہوں لیکن اس معصوم کی کوئی خطا نہیں ہے۔ یہ معصوم بچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہے جو سات دنوں سے پانی کی ایک بوند کے لئے ترستا ہے۔ یہ پیاس کی شدت کو برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ یہ بے زبان بچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پوتا ہے اور شہزادی بانو کا بیٹا ہے۔ اللہ کے واسطے اسے پانی پلا دو۔ آج تم سے مدینے کا شہزادہ امام حسین علیہ السلام سوال کر رہا ہے۔ اس کی پیاس بجھانے سے تمہیں نیک نامی حاصل ہوگی اور ثواب بھی ملے گا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام علی اصغر رضی اللہ عنہ کے ہونٹ چوم کر روتے ہوئے کہتے ہیں کہ " اے میرے ننھے سے پھول میں نے ان سے پانی مانگنے کے واسطے جو کچھ بھی کہہ سکتا وہ میں نے کہہ دیا۔ اب میرے پاس ان سے سوال کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے اب تم اپنی سوکھی زبان نکال کر ان ظالموں کو دکھا دو تاکہ یہ تمہیں پانی دے دیں۔" یہ کہہ سن کر علی اصغر رضی اللہ عنہ اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی سوکھی زبان پھیر لیتے ہیں۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر امام حسین علیہ السلام تڑپ اٹھے اور آسمان کی طرف اپنی نگاہیں کرتا ہے جیسے آسمان سے گواہ رہنے کی تلقین کر رہا ہے اور خدا سے رحم و کرم کی درخواست کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

(خلاصہ)

نظم مُفلسی

نظم "مفلسی" نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے زندگی کی ایک تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ غریبی انسان کے لئے ایک مسلسل عذاب ہے۔ غریبی ہر طرح کی پریشانی کا سبب بنتی ہے۔ مفلسی انسان کو دن رات بھوکا رہنے پر مجبور کرتی ہے اس کا احساس صرف اسی انسان کو ہو سکتا ہے جو اس کا ذرا سا شکار ہوا ہو۔ شاعر کے مطابق غریبی انسان کی عزت اچھالنے میں کوئی قصر باقی نہیں چھوڑتی۔ ایک بھوکا انسان غربت کی وجہ سے دسترخوان پر اسی طرح ٹوٹ پڑتا ہے جس طرح کتے ہڈیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ مفلسی ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی شریف، نیک اور ایماندار کیوں نہ ہو لیکن مفلس ہونے کے سبب کوئی اسے بیوقوف، کوئی گدھا اور کوئی بیل ~~کہتا ہے~~ جیسے نازیبا الفاظ سے پکارتا ہے۔ گویا غریب کی کوئی عزت اور قدر نہیں کی جاتی۔ غریبی کے سبب وہ پرانے پھٹے ہوئے کپڑے زیب تن کئے ہوئے ہوتا ہے اور گرد و غبار کی وجہ سے اس کے بال بھی بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی زبان بھوک کی شدت کی وجہ سے سوکھی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے ~~جسم~~ دانتوں کا رنگ بھی پیلا ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم غربت کی وجہ سے میلا کچیلا اور بہت گندہ ہوتا ہے جیسے قید خانے سے نکلا ہوا قیدی ہوتا ہے۔ شاعر آخر پر اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک کوئی غریبی میں مبتلا نہ ہو کیونکہ غریبی ہی کی وجہ سے ایک شریف انسان کو رسوا ہونا پڑتا ہے۔ اور ان کی عزت خاک میں ملتی ہے۔ آخر پر شاعر کہتے ہیں کہ میں غریبی کی اور کیا کیا خرابیاں بیان کر سکتا ہوں یہ وہ ہی انسان جان سکتا ہے جس کا دل غربت کی وجہ سے لوٹ گیا ہو۔

رامائن کا ایک سین

رام چندر جی ماں سے رخصت لیتے ہوئے

شاعر نے اس نظم میں رام چندر جی کے بن جاتے وقت اپنی ماں سے رخصت لینے کا نقشہ بڑی شاعرانہ فن کاری سے کھینچا ہے۔ رام چندر جی ایودھیا کے راجا دشرت کے بڑے بیٹے تھے۔ راجا دشرت کی تین بیویاں تھیں۔ تینوں کے ہاں اولاد بھی تھی۔ کوشلیا، کیکئی اور سمترا۔ ان کے بیٹے رام چندر جی کوشلیا کے بیٹے، بھارت اور شتروگن کیکئی کے بیٹے اور لکشمن سمترا کے بیٹے تھے۔ راجہ دشرت نے دوسری رانی سے اگلے زمانے میں دو وعدے دئے تھے جن کو راجا دشرت نے پورا کرنا تھا۔ اب کیکئی کے لئے وہ وقت قریب آ گیا اس اپنے آقا کو کئے ہوئے وعدے یاد دلائے۔ پہلا وعدہ کے عوض میں راجہ کو رام چندر جی کو بن باس بھیجنا پڑا اور دوسرے وعدے کے عوض راجہ کو سلطنت کیکئی کے بیٹے بھارت کو دینی پڑی۔ اس وجہ سے رام چندر جی کو بن باس جانا پڑا۔

رام چندر جی بن باس کے لئے روانہ ہو رہے ہیں اور اس کی ماں مایوس نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوں رواں ہونے لگتے ہے۔ وہ اپنے خاموش دہن کو کھول کر رام چندر جی کو چودہ سال کے بن باس کے غم میں شکایتوں اور مصیبتوں کا دفتر سامنے رکھتی ہے۔ ان کا سارا دکھ اور درد الفاظوں کی صورت میں ابھر آتا ہے۔ وہ آنکھوں سے آنسوؤں کے بدلے خون جگر بہا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے رام چندر جی کا دل درد سے بھر آتا ہے۔ ماں کی غمزدہ اور دکھ بھری داستان سننے سے رام چندر جی کے دل پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ اپنے آنسوؤں روکنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی ماں کی حالت اور زیادہ نہ بگڑ جائے۔

رام چندر جی کے بن باس جانے پر ان کے والدین کی حالت دیکھ کر لوگوں کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بے چارے بیٹے کے غم اور جدائی کی وجہ سے زندگی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ خدا کی شان نرالی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے غم کم ہو گیا ہیں کچھ دن روتے رہے پھر دل سے رفتہ رفتہ بیٹے کی جدائی کے غم خاموش ہو گئے۔ رام چندر جی بن باس جاتے وقت اپنے والدین سے کہتے ہیں کہ میں اپنے مالک پر بھروسہ رکھتا ہوں چونکہ جب اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربان ہو جائے گا تو صحرا بھی میرے لئے چمن بنے گا۔ خدا کبھی بھی اپنے بندوں کے حال سے بے خبر نہیں رہتا چاہے بندہ کہیں بھی ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کا کرم ہو تو مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ خدا کے کرم سے مجھے صحرا اپنی ماں کے دامن سے کم نہ ہوگا۔

M	T	W	T	F	S	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30					

September 2014

M	T	W	T	F	S	S
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30	31		

October 2014

اولوالعزمی (خلاصہ)

اس نظم کو محمد حسین آزاد نے زیب قرطاس کیا ہے۔ اس نظم میں وہ حرف اپنے زمانے کے عوام و خواص کو بلکہ تمام انسانوں کو سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تمہارے سامنے ایک کھلا ہوا میدان ہے۔ لہٰذا تم آگے بڑھتے جاؤ اور اپنے مستقبل کے راستے اپنے لئے ہموار بنا دو کیونکہ تمہاری منزل تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ شاعر یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ایک انسان یا قوم کو عزت اور کامیابی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب وہ عزم و ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔

شاعر فرماتے ہیں کہ ہمت اور حوصلے سے کام کرنے والوں کے سامنے بڑے بڑے ظالم اور جابر سر جھکاتے ہیں۔ اور ان کے سامنے آنے والا ہر طوفان پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہوگا۔ شاعر ایک عام انسان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم اپنے نیک کاموں کے معاوضوں کی فکر میں مت رہو۔ خدا نیک کاموں کا اجر خود دیتا ہے۔ جب وہ کسی کو عزت بخشتا ہے تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نیکی و بدی، ظلم و عدل اور امن و انتشار کے درمیان ازل سے ہی جنگ جاری ہے۔ شیطان اور آدم کے درمیان جنت سے ہی لڑائی جاری ہے مگر جیت ہمیشہ سچائی، نیکی اور عدل کی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا باطل کو ایک ضرور مٹ جانا ہے۔

تمہاری وجہ سے یہ اندھیرا بھی روشنی میں بدل جائے گا۔ جس طرح سورج اپنی آمد سے رات کی ظلمتوں کا صفا کر کے ساری دنیا کو نور سے منور کرتا ہے اسی طرح باعزم اور باہمت لوگ ظلم اور ظالموں کا صفایا کریں گے۔ ایک مخلص انسان کی اپنے ملک سے جو امیدیں، تمنائیں اور خواب وابستہ ہوتے ہیں وہ سچی تڑپ، محنت لگن اور مسلسل کوشش سے حقیقت میں ضرور بدلتے ہیں۔ لہٰذا ایک سچے مجاہد کو کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور نہ ہی اسے ناامید ہونا چاہیے۔ تم آگے بڑھتے جاؤ اور دیکھو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

NOTES

جگنو (خلاصہ)

یہ نظم "جگنو" علامہ اقبالؒ نے تحریر کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں کثرت میں وحدت کے راز کو ایک دلکش انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو خصوصیتوں سے نوازا ہے۔ جگنو ہو یا پروانہ، چاند ہو یا بلبل، پھول ہو یا شبنم کوئی بھی چیز فضول نہیں ہے۔ شاعر فرماتے ہیں جگنو کی روشنی چمن میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے جس طرح پھولوں کی محفل میں شمع چمک رہا ہو۔ شاعر جگنو کو کبھی پھولوں کی محفل کا شمع، کبھی چاند کے قبا کی تکمے، کبھی سورج کے چمکیلے لباس کے حصے وغیرہ سے تشبیہات دیتا ہے۔ شاعر پروانے اور پتنگے کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پروانہ بھی ایک اڑنے والا کیڑا ہے اور پتنگا بھی ایک اڑنے والا ایک معمولی سا کیڑا ہے مگر پروانہ روشنی کا طلبگار اور دیوانہ ہوتا ہے اور پتنگا سراپا روشنی ہی روشنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کو اپنی جگہ ایک منفرد خصوصیت دی ہے۔ پروانے کو تپش اور جگنو کو روشنی سے منور کیا ہے۔

اس کائنات کے ذرے ذرے میں اللہ تعالیٰ کے حسن کی جھلک عیاں ہے جس طرح انسان کو بولنے کی صلاحیت عطا کی گئی اسی طرح کلی کو چٹکنے کا وصف، بے زبان پرندوں کو میٹھی آوازیں، پھولوں کو زبان دے کر خاموشی کی تعلیم عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ درختوں کو سایے عطا کئے ہیں ہوا اُن کو پرواز دی ہے، پانی کو روانی بخشی ہے، اور سمندر کی لہروں کو بے قراری دی۔ شاعر فرماتے ہیں جو ہمارے لئے اندھیری رات ہوتی ہے مگر جگنو کے دن کی شروعات ہماری رات سے ہی ہوتی ہے۔

شاعر فرماتے ہیں کہ پھول اور بلبل کی خوبیاں اور خصوصیتیں حقیقت میں ایک ہی ہے لیکن ہم ہی ان کو الگ الگ محسوس کرتے ہیں۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر چیز میں کثرت میں وحدت کا راز پوشیدہ ہے۔ جگنو کی چمک اور پھولوں کی مہک دراصل ایک چیز ہے۔ یعنی ہر ایک چیز میں حسن ازل موجود ہے جو مختلف ہوتے ہوئے بھی انہیں ایک بنا دیتا ہے۔

شاعر فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کہ ہر ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کے حسن کی جھلک موجود ہے تو پھر ہمارے جھوٹے اختلافات اور غلط فہمیاں جھگڑوں کا سبب بنتی ہے۔ اقبال وحدت کے کثرت میں اس چھپے ہوئے راز سے پردہ ہٹا کر بنی نوع انسان کو بیدار کرکے اس کو یکجہتی اور امن کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ انسان غور و فکر کرنے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

شکست انتظار

یہ نظم "شکست انتظار" مرزا محمد یسین بیگ کی تحریر کردہ ایک اصول نظم ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ انتظار انسان کا مقدر ہے۔ انسانی زندگی کا دوسرا نام انتظار بھی رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ساری زندگی کسی نہ کسی چیز کی انتظار میں گزرتی ہے۔ اسی مناسبت سے انسان کی تمام عمر امید و خوف کی کھینچا تانی یا کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ نا امیدی موسم خزاں کی طرح دھندلی دھندلی اور اداس لگتی ہے۔ شاعر نے اس نظم میں اسی آخری کیفیت کی تصویر کشی بڑے دلکش اور موثر انداز میں کی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ موسم خزاں میں چناروں کو زرد پتے صبح و شام ایک چراغ کی طرح راستوں کو روشنی سے منور کرتے ہیں۔ گرد و غبار سے آلودہ فضا گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح کے ماحول میں انسان ہر کام سے قاصر دکھتا ہے اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ جن حسین نظاروں کی منتظر انسانی آنکھیں ہوتی ہے وہ ایسے ماحول میں میسر نہیں ہوتی ہے۔ اس اندھیری رات کا روشنی میں تبدیل نہ ہونا انسان کے دل کو آزردہ کرتا ہے۔ یعنی اندھیری رات ختم ہونے کو نہیں آتی۔ شاعر فرماتے ہیں کہ جس طرح زمین پر ہر چیز نا امیدی اور محرومی کا مظاہرہ کر رہی ہے اسی طرح آسمان پر چمکنے والے ستاروں کا نام و نشان ہی نہیں رہا اور سیاہی اور اندھیری آسمان تک پھیلی ہوئی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اسی نا امیدی اور مایوسی کے اس عالم میں ایک عاشق اپنے معشوق کا انتظار کرتا رہتا ہے وہ شاید اس بات سے واقف نہیں ہے کہ محمل لیلیٰ ایک بار جو گزر گیا تو وہ پھر دوبارہ لوٹ کے نہیں آتا۔ یعنی جو چیز انسان کے ہاتھ سے ایک بار چھوٹ جاتی ہے وہ دوبارہ ہاتھ نہیں آتی۔ گویا شاعر موجودہ دور کے زمانے کی عکاسی کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتے کہ "قیس" موجودہ دور میں معاشی بدحالی میں پھنسے ہوئے بے روزگار کی علامت ہے اور جو لیلیٰ کا منتظر ہے یعنی ذریعہ معاش اور خوشحالی کے انتظار میں ہے۔ جس کا کہیں نام و نشان ہی نہیں ہے۔ کیونکہ انتظار ازل سے ہی جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔

NOTES

میر انیس کی رباعیاں

رباعی 1

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

میر انیس اس رباعی میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو دنیا میں عزت اور بلندی عطا فرماتا ہے اس کے دل میں عاجزی اور انکساری اپنا مسکن بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس جو کم عقل اور نافہم انسان اپنی تعریفیں خود کرنے لگتے ہیں کیونکہ ان کو تھوڑا سا رتبہ ملا ہوتا ہے وہ ایک خالی برتن کی طرح ہوتے ہیں جو ذرا سا چھیڑنے پر آواز دیتا ہے۔

رباعی ۲

ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری — افزوں ہے تیرے غضب سے رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جلا — وہ رحم تیرا ہے یہ عدالت تیری

میر انیس اس رباعی میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تو اپنے بندوں سے ان کے والدین سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ تیرے غضب سے زیادہ تیری رحمت زیادہ بڑی ہے۔ یہ تیرا کرم اور رحم ہے کہ اگر تو اپنے بندے کو جنت عطا فرمائے گا۔ لیکن دوزخ میں جانا تیری عدالت ہے یعنی وہ بندے کا اپنے گناہوں کی سزا ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے بندوں پر الطاف کرنے والا مہربان ہے۔

رباعی ۳

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا — جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس — ہم ہو گا اور قبر کا کونا ہوگا

میر انیس اس رباعی میں مرنے کے بعد کا منظر تشویش کے عالم میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ایک انسان کو موت آئے گی موت چونکہ ہر ایک کو آنی ہی آنی ہے تو انسان کو قبر کی آغوش میں سونا ہوگا جہاں صرف بستر اور بچھونا خاک ہی ہوگی دنیا کی طرح کوئی آرام و آسائش نہیں۔ انسان کو وہاں قبر کی تنہائی میں اپنے اعمال کے سوا کوئی ساتھ دینے والا نہیں ہوگا۔ وہاں صرف انسان اور قبر کی اندھیری ہوگی۔

NOTES

Scanned with CamScanner

Wednesday 13 AUG 2014

جگت موہن لال رواں

رُباعی ۱

دُنیا سو سو طرح سے بہلاتی ہے
سامانِ خوشی سے روح گھبراتی ہے
اب فکرِ فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں
کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

اس رباعی میں رواںؔ فرماتے ہیں کہ دُنیا کی خوشیوں اور شادمانیوں کے سامان انسان کو اسی طرح بہلاتے ہیں جس طرح ایک بچے کو کھلونے دے کر بہلایا جاتا ہے۔ لیکن جب انسان کو اپنی زندگی کی حقیقت سمجھ آ جاتی ہے۔ تو اس کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ جب اُس کو اس بات کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ ہمیں ایک دن اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے تو پھر اُسے دُنیا کی ہر چیز میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

رُباعی ۲

حرص و ہوس حیات فانی نہ گئی
اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگ مزار پر تیرا نام رواںؔ
مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

رواںؔ اس رباعی میں فرماتے ہیں کہ اس فنا ہونے والی زندگی سے کبھی انسان کے دل سے لالچ ختم نہیں ہوئی وہ دنیا سے بہت محبت اس قدر کرتا ہے کہ مرنے کے بعد اسی کی قبر پر ایک پتھر پر اس کا نام کندہ کروایا جاتا ہے تاکہ مرنے کے بعد بھی نام و شہرت باقی رہے۔

رُباعی ۳

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی
بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گُل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا
اک موج فضا تھی زندگانی کیا تھی

شاعر میر انیسؔ اس رباعی میں انسان کی ناپائیدار زندگی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ جو عمر انسان کی ڈھل گئی ہے یعنی بچپن وہ ایک پھول کی مہک اور جوانی ایک ہوا کا جھونکا تھا جو ادھر سے آیا اور اُدھر سے چلا گیا۔ اس زندگی کی مثال ہوا کی ایک لہر سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یعنی انسان کی زندگی بہت ہی مختصر اور ناپائیدار ہے۔

NOTES

قطعہ

نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام

اس قطعہ کو مولانا الطاف حسین حالی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس قطعے میں حالی ہمیں نوکروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور یہ بات باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ظالمانہ رویہ اختیار کرنے سے ہم کسی کا دل جیت نہیں سکتے اور نہ ہی ہم کسی کی وفاداری حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ظالمانہ رویہ اختیار کیا تو مولانا حالی فرماتے ہیں کہ ہمارا انجام بھی اُسی آقا کی طرح ہوگا جو بڑے بے رحمی کے ساتھ اپنے نوکروں پر پیش آتا تھا۔ نوکروں سے کام زیادہ لینا، تنخواہ کم دینا، اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سزا دینا اس کا معمول تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب نوکر اس کے مخالف ہو گئے۔ معمولی سی رعایت کی درخواست پر اُن سے ان کا دیا ہوا شرائط نامہ دکھانے کو کہا جاتا تھا کہ دیکھا جائے کہ واقعی اس رعایت کا کچھ شرط ہے کہ نہیں۔ مگر اس شرائط نامے میں سوائے تھوڑی سی تنخواہ کے آقا کی کوئی ذمہ داری درج ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور ہر قسم کے نقصانات کی ذمہ داری نوکروں پر ہی تھی۔ نوکر وہ شرائط نامہ دیکھ کر لاجواب ہو جاتے تھے اور دل ہی دل میں اپنے آقا کی دشمنی پالتے تھے۔

ایک روز آقا ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے۔ اچانک گھوڑا اس کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور گھوڑے سے گر جاتا ہے لیکن اس کا پاؤں رکاب میں پھنس جاتا ہے۔ بے چارہ آقا حسرت کی نگاہوں سے غلام کی طرف مدد کی غرض سے پکارتا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ کہتا ہوا آقا کو موت کے منہ میں جانے دیتا ہے کہ ایسے موقع پر تمہاری مدد کرنا میرے شرائط نامہ میں درج نہیں ہے۔ دراصل مولانا حالی اس کہانی کے ذریعے ہمیں اس بات سے باخبر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہمیں اپنے ماتحتوں سے ہمیشہ ہمدردی کے ساتھ پیش آنا چاہیے تاکہ وہ بھی سچے دل سے ہماری خدمت کر سکیں۔

(حصہ شاعری)

(قصیدہ، مرثیہ، نظم، رباعی، قطعہ، نعت)

سوالات

قصیدہ شہر آشوب

سوال 1:- سودا نے اس قصیدے میں جن پیشوں کا ذکر کیا ہے، اُن کی فہرست بنائیے؟

جواب:- مندرجہ ذیل پیشوں کا ذکر سودا نے اس قصیدے میں کیا ہے:-
گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے، سوداگری، شاعری، ملائی، مثنوی خوانی، مدرسی، تجارت اور شیخ وغیرہ۔

سوال 2:- اس نظم میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی اب بدل گئے ہیں، یا جو اب استعمال نہیں ہوتے۔ ان کو لکھئے؟

جواب:- ایسے الفاظ جن کے معنی بدل گئے ہیں یا جو اب استعمال نہیں ہوتے:-
یاں، کسو کی، ٹک، انہوں کا، واں، چھٹتے ہی وغیرہ۔

سوال 3:- "شہر آشوب" سے کیا مراد ہے؟

جواب:- شہر آشوب ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر یا ملک کی بدحالی، تباہی یا زمانے کی عام ابتری کا ذکر ہو۔

سوال 4:- اس قصیدے کو شاعر نے شہر آشوب کیوں قرار دیا ہے؟

جواب:- شہر آشوب اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی ملک کی بدحالی اور تباہی و بدنظمی کا ذکر ہو۔ اس قصیدے میں بھی شاعر نے دلی کے ان حالات کا جائزہ لیا ہے جب دلی پر ظلم و جبر کے پہاڑ لوٹ پڑے اور انہیں انگریزوں نے تباہ و برباد کیا اسی لئے شاعر نے اس قصیدے کو شہر آشوب قرار دیا ہے بالکل موزوں ہے۔

نعت

سوال 1:- حضرت محمدؐ کیا پیغام لے کر آئے؟

جواب:- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالمِ انسانیت کے لئے امن اور بھائی چارے کا پیغام لے کر آئے۔

سوال 2:- شاعر نے کیوں کہا ہے؟

مگر بن کے رحمت تو عالم پہ چھایا
تو وہ سروِ قامت نہیں جس کا سایہ

جواب:- شاعر نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سروِ قامت یعنی قد آور سرو کے ساتھ تشبیہ دے کر کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالمین کے لئے رحمت بن کر آئے۔ قرآن میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کا لقب دیا گیا اسی لئے شاعر نے بھی اسی بات کی مناسبت سے یہ شعر کہا ہے۔

Scanned with CamScanner

مرثیہ

سوال 1:۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزیدی فوج سے کیا سوال کیا؟
جواب :۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزیدی فوج سے حضرت علی اصغرؓ کے لئے پانی مانگنے کا سوال کیا جو صرف چھ ماہ کا بچہ تھا۔

سوال 2:۔ سیاق و سباق اور شاعر کا حوالہ دے کر اس بند کی وضاحت کیجئے:۔

یہ کون بے زبان ہے تمہیں کچھ خیال ہے ۔۔۔ دُرِ نجف ہے بانوئے بے کس کا لعل ہے
لو مان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے ۔۔۔ یثرب کے شہزادے کا پہلا سوال ہے
ہو تا مل کا تم سے طلب گار آب ہے ۔۔۔ دے دو کہ اس میں نام وری ہے ثواب ہے

جواب:۔ یہ بند ہماری درسی کتاب "بہارستانِ اردو" کے مرثیہ " حضرت علی اصغر کے لئے پانی مانگنا" سے لیا گیا ہے جو مرزا سلامت علی دبیر نے لکھا ہے۔ شاعر اس بند میں فرماتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام یزیدی فوج سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ یہ چھ ماہ کا بچہ نجف کا موتی ہے بانوئے بے کس کا (لختِ جگر۔ تمہیں خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں۔ یہ آپ سے میرا پہلا سوال ہے۔ یہ چھ ماہ کا علی اصغرؓ تمہیں پانی مانگنے آیا ہے۔ اگر تم اس کو پانی دو گے اس میں تمہاری ہی نام وری ہے اور تمہیں بے حد اجر و ثواب ملے گا۔

<< نظم :۔ مفلسی >>

سوال 1:۔ مفلسی آدمی کو کس کس طرح سے ستاتی ہے؟
جواب :۔ ایک انسان جب مفلسی میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو کئی طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مفلسی کی وجہ سے انسان کو بھوکا پیاسا رہنا پڑتا ہے، اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے ہیں اور بدن پر میل جما ہوا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُسے جگہ جگہ بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سوال 2:۔ مفلس کو ہر وقت کس چیز کی فکر رہتی ہے؟
جواب :۔ مفلسی جب انسان پر مفلسی کے آثار نمودار ہونے ہیں تو اُسے پھر ہر وقت روزی روٹی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔

سوال 3:۔ اس بند کی تشریح کیجئے:۔

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل ۔۔۔ کوئی گدھا کہے اُسے ٹھہرا دے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام بڑے بال پھیل پھیل ۔۔۔ منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

جواب:۔ یہ بند نظیر اکبر آبادی کی نظم "مفلسی" سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس بند میں فرماتے ہیں کہ ایک انسان چاہے کتنا ہی شریف اور عزت دار کیوں نہ ہو۔ لیکن جب وہ مفلسی میں

Scanned with CamScanner

مبتلا ہوتا ہے تو اس کو ہر وقت ہزاروں مشکلاتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُسے لوگ گدھے کی مانند سمجھتے ہیں، اس کے بدن پر کپڑے پھٹے ہوئے ہوتے ہیں، بدن پر میل جما ہوا ہوتا ہے اس کا منہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے خشک اور دانت پیلے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی شکل قیدی جیسی ہوتی ہے۔ گویا مفلسی انسان کو طرح طرح کے دُکھ دیتی ہے۔

سوال ۱۱:- جملے بنائیے:- دل جلانا، چھاتی پر مونگ دلنا، جان پر کھیلنا، نظر لگنا۔؟

جواب:- دل جلانا = سخت رنج دینا = کسی کا دل نہیں جلانا چاہیے۔

چھاتی پر مونگ دلنا = رشک دلانا = رشید نے نوکری حاصل کی اب اس کی چھاتی پر مونگ دلتے ہیں۔

جان پر کھیلنا = جان خطرے میں ڈالنا = پروانے کی فطرت ہے کہ وہ جان پر کھیلتا ہے۔

نظر لگنا = بری نظر کا اثر ہونا = ہماری وادیٔ کشمیر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔

رامائن کا ایک سین — رام چندر جی ماں سے رخصت لیتے ہوئے

سوال ۱:- رام چندر جی کو دیکھ کر اس کی ماں کیوں رونے لگی؟

جواب:- رام چندر جی کو دیکھ کر اس کی ماں اس لئے روتی ہے کیونکہ رام چندر جی کو چودہ سالوں کے لئے بن باس جانا تھا جو اس کو برداشت نہیں ہوتا تھا۔

سوال 2:- رام چندر جی نے ماں کا حال دیکھ کر آنسوں کیوں روک لئے؟

جواب:- رام چندر جی جانتے تھے کہ اگر اس کی آنکھوں سے بھی اس کی ماں کے سامنے آنسوں نکلے تو اس کی ماں کی حالت اور زیادہ خراب ہو جائے گی اسلئے انہوں نے اپنے آنسوں روک لئے۔

سوال 3:- شاعر کا حوالہ دے کر سیاق و سباق کے ساتھ ان اشعار کی وضاحت کریں:-

اپنی نگاہ ہے کرمِ کارساز پر — صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر — رہتا نہیں وہ حال سے بندوں کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں — دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں۔

جواب:- یہ بند ہماری درسی کتاب "ہمارستانِ اردو" کی نظم "رامائن کا ایک سین" "رام چندر جی ماں سے رخصت لیتے ہوئے" سے لیا گیا ہے اس کو چکبست نے تحریر کیا ہے۔ رام چندر جی اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے کرم کی نگاہ مجھ پر ہوگی اور اس کی مہربانی ہوگی تو صحرا یعنی جنگل اور بیاباں بھی میرے لئے چمن کے برابر ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی حالت میں اپنے بندوں سے بے خبر نہیں رہتا۔ اگر اس کا کرم اور مہربانی ہوگی تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے میرے لئے جنگل کا دامن اپنی ماں کے دامن سے کم نہیں ہوگا۔

Scanned with CamScanner

سوال 5:۔ "ہر موئے تن زبان کی طرح بولنے لگا"..... اس مصرعے کے ذریعے شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟

جواب:۔ اس مصرعے کے ذریعے شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رام چندر جی کی ماں رام چندر جی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی جدائی کی وجہ سے بے قرار اور بے سکون تھی۔ یہ ساری حالت اس کے ~~چہرہ~~ چہرے پر عیاں تھی۔

سوال 6:۔ چکبست کی نظم سے فارسی مرکبات تلاش کر کے ان کے معنی لکھیے؟

جواب:۔ (1) حیرانِ زخم = زخم کا کھلا ہونا (2) حرفِ بیاں = بیان سے نکالنا

(3) بابِ سخن = شاعری کا باب (4) قفلِ دہن = منہ کا تالا

(5) دستِ یاس = نا امیدی کا ہاتھ (6) برگِ خزاں = خزاں کا پتا، سوکھا ہوا پتا

(7) رنگِ سخن = بولنے کا طریقہ۔

سوال 7:۔ ان الفاظ کے متضاد لکھیے:۔

حضر، محال۔ قریب۔ صحرا۔ ہجر۔ تیز۔ عیاں۔

جواب:۔ سفر، ممکن، بعید۔ گلشن، وصال، سست، نہاں۔

نظم اولوالعزمی

سوال 1:۔ اس نظم کا موضوع کیا ہے؟

جواب:۔ اس نظم کا موضوع "اولوالعزمی" ہے جس کے معنی بلندی، رتبہ، یا عزت کے ہیں۔ بلند مرتبہ اور عزت حاصل کرنے کے لیے مستحکم ارادے سے آگے بڑھنا ہوتا ہے جس سے انسان زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

سوال 2:۔ اس نظم کا کون سا شعر آپ کو پسند ہے؟

جواب:۔ ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہو تو سر کو جھکائیں گے

سوال 3:۔ اس نظم میں استعمال شدہ چند قافیے چن کر لکھیے؟

جواب:۔ مندرجہ ذیل قافیے اس نظم میں استعمال ہوئے ہیں:۔

میداں، افشاں، بیاباں، یاں، جہاں
اٹھائیں، جھکائیں، جائیں، دبائیں
ہموار، امیدوار، خوار، بہار۔

NOTES

Scanned with CamScanner

July 2014

M	T	W	T	F	S	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	31			

August 2014

M	T	W	T	F	S	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

نظم: جگنو

سوال 1:- تشریح کیجئے:-

رنگین نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو — گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی — پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

جواب:- یہ بند علامہ اقبالؒ کی نظم "جگنو" سے لیا گیا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر چیز کو اپنی خوبیوں سے نوازا ہے۔ اس نے بے زبان پرندوں کو میٹھی اور سریلی آواز عطا کی ہے، پھولوں میں مہک دی ہے ان کی مہک ہی گویا ان کی بولی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پروانے کو عشق کا ایسا جذبہ اور چنگاری عطا کی ہے کہ وہ شمع کے گرد منڈلاتا ہوا اپنی جان کی بازی لگاتا ہے اور جگنو کو روشنی ہی روشنی بنایا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو دل لبھانے والی صلاحیت اور خصوصیت بخشی ہے۔

سوال 2:- شاعر نے کیوں کہا ہے؟ کہ

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

جواب:- شاعر نے یہ بات اس لئے کہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ اس نے ہر چیز میں اپنے نور کا جلوہ رکھا ہے جس سے وہ چیزیں حرکت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حسن کی جھلک دنیا کی چیز میں موجود ہے جس طرح انسان کو اللہ نے بولنے کی صلاحیت بخشی ہے اسی طرح پھولوں کے غنچوں کو چٹک دی ہے گویا غنچوں کا چٹکنا انسان کے بولنے کے مترادف ہے۔

سوال 3:- "وحدت میں کثرت" سے کیا مراد ہے؟

جواب:- وحدت میں کثرت سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہونے کے باوجود بھی اس کی جھلک دنیا کے ہر ذرے میں موجود ہے۔

سوال 4:- ان اشعار میں تشبیہیں تلاش کیجئے؟

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
رنگین کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت — پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی میں

جواب:- چاند کے قبا کے تکمے کو جگنوں سے تشبیہ دی گئی ہے
سورج کے پیرہن کو بھی جگنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

NOTES

سحر کو بانکی ہوئی دلہن سے تشبیہ دی گئی ہے۔
شبنم کے قطروں کو زیورات سے تشبیہ دی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

نظم شکستِ انتظار

سوال 1:۔ نظم "شکستِ انتظار" میں کس طرح کی ذہنی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے؟
جواب:۔ نظم "شکستِ انتظار" میں نا امیدی اور اُداسی کی آخری کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

سوال 2:۔ کھڑکی میں بیٹھے ہوئے مجنوں قیس اور محمل لیلیٰ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
جواب:۔ کھڑکی میں بیٹھے ہوئے مجنون قیس سے مراد دورِ حاضر کا بے روزگار نوجوان اور محمل لیلیٰ سے مراد باوقار ذریعہ معاش یعنی پُر اطمنان روزگار جس سے زندگی خوش حالی سے گزر بسر ہو سکے۔

میر ببر علی انیس ۔ رباعی

سوال 1:۔ دنیا میں کون لوگ نرمی اور تواضع اختیار کرتے ہیں؟
جواب:۔ دنیا میں وہی لوگ نرمی اور تواضع یعنی عاجزی اور انکساری اختیار کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اعلیٰ مرتبہ اور عزت سے نوازتا ہے۔

جگت موہن لال رواں ۔ رباعی

سوال 1:۔ شاعر کو ہر بات میں کلفت کیوں نظر آتی ہے؟
جواب:۔ شاعر کو جب دنیا کی بے ثباتی کا یقین ہو جاتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اس لیے اس کو ہر بات میں کلفت یعنی تکلیف اور دکھ محسوس ہوتا ہے۔

سوال 2:۔ تیسری رباعی میں تشبیہیں تلاش کریں؟
جواب:۔ تیسری رباعی میں مندرجہ ذیل تشبیہیں استعمال ہوئی ہیں:۔
بچپن کو پھولوں کی خوشبو سے تشبیہ دی گئی ہے۔
جوانی کو ہوا کے جھونکے سے تشبیہ دی گئی ہے۔
اور زندگی کو موجِ فضا سے تشبیہ دی گئی ہے۔

سوال 3:۔ یہ کس قسم کے مرکبات ہیں۔
سامانِ خوشی ۔ حرص و ہوس ۔ حیاتِ فانی

NOTES

جواب:۔ دئے گئے مرکبات فارسی کے مرکبات ہے اور یہ مرکبات مرکب توصیفی ہے۔

02 Saturday

"نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام" نظم قطعہ

سوال ۱:- یہ کہانی بیان کرنے سے حالی کا کیا مقصد ہے؟

جواب:- یہ کہانی بیان کرنے سے حالی کا صرف ایک مقصد ہے کہ ہمیں اپنے ماتحتوں یعنی نوکروں وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہیئے۔ اگر ہم اِن سے اچھا سلوک کریں گے تو وہ دل و جان سے ہمارے فرمانبردار اور وفادار بن جائیں گے۔

سوال ۲:- ہمیں اپنے ماتحتوں سے کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہئے؟

جواب:- ہمیں اپنے ماتحتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردی جیسا برتاؤ کرنا چاہیئے

سوال ۳:- مندرجہ ذیل اشعار کو نثر میں بدل دیں:-

کی بہت کوشش نہ چھوٹی پاؤں سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آکر معین
تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعین

جواب:- یہ اشعار الطاف حسین حالی کے قطعہ "نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام" سے لیے گئے ہیں حالی فرماتے ہیں ایک آقا جو اپنے نوکروں پر سخت ظلم کرتا تھا جو ایک مرتبہ ایک شریر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اچانک گھوڑا اس کی قابو سے باہر ہوگیا اور وہ آقا زمین پر گر پڑا لیکن اس کا ایک پاؤں گھوڑے کے زین کی رکاب میں پھنس گیا اُس نے بے حد کوشش کی مگر اس سے پاؤں رہا نہ گیا اُس نے گھوڑے کی رکھوالی کرنے کی طرف اشارہ کیا کہ وہ آکر اس کو بچائیں مگر وہ غلام بھی اس کے ظلم و جبر کرنے کی وجہ سے سنگ دل اور بے رحم ہو چکا تھا وہ دور سے ہی اس کا تماشا دیکھتا تھا اور جیب سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالتے ہوئے اپنے آقا کو یہ کہتا تھا کہ دیکھو سرکار اس میں یہ شرط نہیں لکھی ہے کہ تجھے مصیبت کے وقت کام آیا جائے۔

NOTES

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔
اٰمِیْن بِجَاہِ النَّبِیِّ الْکَرِیْم۔

Gumgeen Dar
Nowgam Ehrari Sharief

Notes Prepared By. Gumgeen Sheraz Dar.
M.A. B.Ed. 7889726757

نوٹ:- لکھنے میں کہیں پر کوئی خامی ہو تو براہِ کرم تنقید نہ کرے اصلاح کرنے کی کوشش کیجئے.....!

Scanned with CamScanner